

R.NO. 2136/57

مکتبہ اسلامیہ لاہور

۱۵/۹/۶۰

ستمبر ۱۹۶۰ء

کتاب

199633

قیمت فی کاپی

پاکستان

ہندوستان

۱۲

۵۵ روپے

مکتبہ اسلامیہ لاہور

پاکستان

۵۵ روپے

۵۷۰
N 65 N-9
1960

تصانیف نیاز فختوری

من ویزواں ہندو مسلم نزارع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل النایت
 مولانا نیاز فختوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم
 کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو النایت کبریٰ اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور مذہب
 کی تحقیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدس کی تاریخ پر تاریخی و علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند
 انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے اس کی مختصر فہرست
 مجموعہ مذہبی استفسارات جوابات یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب
 و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) سچ علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان
 (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دھار (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یا جوج و ماجوج (۱۸) نادرۃ مارت
 (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ صفحات ۲۴۲۔ کاغذ دبیر قیمت
 پانچ روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

جمہورستان ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی
 زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ
 ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں، جو پہلے ایڈیشنوں
 میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل
 کیا ہے اس کا انداز اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے
 ہیں۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے
 اس لیے صفحات بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں) ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے
 لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب جیسے معلوم ہوتے
 ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا اور ۲۸ نوٹ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپے (علاوہ محصول)

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف
 سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ جنہیں حضرت نیاز کی انشاء
 نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عظیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت مجاری کے
 اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، تفصیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشاء عالیہ
 سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوب خط ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

دوست بنانے
اور
دوستی بڑھانے کے لیے

ہمیشہ استعمال کیجیے



گولڈ کوائن
اصلی
اپل جوس
صاف و شفاف

بنانے والے

۱۱۵۵
۱۹۶۰

ڈاکٹر مسکین بروریز لمیٹڈ

قائم شدہ ۱۸۵۵ء
لکھنؤ
سولن بروری - لکھنؤ ڈسٹری - کسولی ڈسٹری
مومین نگر بروری اینڈ لائیڈ اینڈ سٹریز (یو پی)



چراغ منزل

یہ اٹھے پہ، چہرے پہ ہیں بھڑیاں یا بڑھاپے کا پھیلا ہوا جال ہے!
 ڈانہی بھڑیوں میں مگر عقل و دانش کے کچھ ایسے نکتے نہراں ہیں،
 جو اس طفل کس کو محنت، محنت کے دستور سکھلائیں گے،
 چراغوں کی مانند جو منزلوں کی اسے راہ دکھلائیں گے!
 جواں ہو کے اپنے تجربوں سے سیکھے گا، ڈھونڈے گا خود اپنی راہیں،
 پھر آئے گا وہ دن جب اس نوجواں کی تنومند مضبوط باہیں،
 ہزاروں جواں بازوؤں کی رفیق و مددگار بن جائیں گی...
 وہ بازو جو مصروف محنت ہیں اک عالم نو کی تعمیر کے واسطے
 وہ اک عالم نو ذرا اور بھی دور ہو گا جو علم سے،
 جہاں ہو گی خوشیاں ذرا اور نزدیک ہم سے!

آج بھی پہلے کی طرح ہماری مصنوعات آپ کے گھروں کو زیادہ صاف، زیادہ تندرست اور زیادہ مطمئن بنانے
 میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن آج ہم...
 کل کیلئے کام کر رہے ہیں، جب زیادہ آرام دہ زندگی کیلئے آپ کی برصغریٰ ضروریات اور زیادہ سہولتوں کی طلبگار ہوئی۔ اور
 ہم زیادہ وسیع ذرائع، نئی ایجادوں اور نئی مصنوعات سے اس وقت بھی آپ کی خدمت کیلئے تیار پائے جائیں گے!

آج اور ہمیشہ... چند دستان لیور کا آدرش — کمز کھسار کی خدمت

PA 4822VD

اس امر کی کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو گیا

نگار

دائیں طرف کا صلیبی نشان علامت ہے

ادبیر: نیاز فتحپوری

شمارہ ۹

فہرست مضامین ستمبر ۱۹۰۶ء

۳۹ واں سال

باب الاستفسار نیاز فتحپوری ۴۰
دعوت فکر و نظر مختلف شعراء ۴۳
منظومات : دانش فرازی - فضا ابن فضا - شفقت کاظمی
شفا گو الیاری - میتین نیازی - جاوید چیم آبادی
طالب جے پوری - غنی احمد غنی - سعادت نظیر
اکرم دھولیوی
مطبوعات موصولہ نیاز فتحپوری ۵۱

ملاحظات نیاز فتحپوری ۳
مہد اور نگ زیب کی ایک ہم تاریخی دستاویز - پروفیسر طبعی احمد ۶
سرحد منصور کی حریت فرمان فتحپوری ۱۶
چند گھنٹے قادیان میں نیاز فتحپوری
قصائد ذوق محمد انصار اللہ نظر ۲۴
باب الانتقاد نیاز فتحپوری ۳۲
صوفی فلاسفہ نواب محمد عباس طالب صفوی ۳۸

ملاحظات

ہمارے طبقاتی و لسانی اختلافات اس وقت دنیا کی کوئی حکومت ایسی نہیں جو کسی نہ کسی الجھن میں گرفتار نہ ہو۔ وہ حکومتیں جو اپنے داخلی سیاست و نظام کی طرف سے مطمئن ہیں وہ بھی بیرونی سیاست کی پیچیدگیوں میں مبتلا ہیں چہ جائیکہ وہ جو قسمتی سے ان دونوں میں ناکام ہیں کہ ان کو تو پریشانی و مضطرب ہونا ہی چاہئے۔

اس وقت ہندوستان بھی ایشیا کے ان چند ممالک میں سے ہے جو اسی مصیبت میں مبتلا ہے اور باوجود انتہائی کوشش کے وہ اب تک ذہنی امن و سکون حاصل نہیں کر سکا۔

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے، چالیس پچاس کروڑ انسانوں کا ملک اور انسان بھی وہ جو ذہنی حیثیت سے بڑی حد تک قطعاً غیر انسان ہے۔ پھر اگر یہاں کی آبادی چند کروڑ تک محدود ہوتی تو ممکن تھا ان کی ذہنیت کو دس بیس سال میں بدل دیا جاسکتا۔ لیکن حیوانوں کی اتنی بڑی جماعت کو انسان بنانا آسان کام نہیں، خاص کر اس صورت میں کہ وہ افراد جو انسان بنانے کے مدعی ہیں اکثر دے شتر خود بھی غیر انسان ہوں ملکوں کی ترقی کا انحصار صرف اتحادِ عمل پر ہے۔ یہ تو سب جانتے اور کہتے ہیں، لیکن اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ اتحادِ عمل کی اولین شرط "اتحادِ ذہن و فکر" ہے اور انسوس ہے کہ یہ ہمارے یہاں قطعاً نہیں پایا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ہمارے اندر صحیح جذبہ وطن پرستی پیدا ہو جائے

تو ذہنی انقلاب بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کی آبادی کا تعلق ہے یہ جذبہ پیدا کرنا بہت مشکل ہے، کیونکہ یہاں وطن سے زیادہ اہم ایک اور چیز بھی ہے۔ "مذہب" اور جب تک اس کی اہمیت کو دماغ سے دور نہ کیا جائے، وطنیت اس کی جگہ نہیں لے سکتی اور ہم وطن کو صحیح معنی میں وطن نہیں سمجھ سکتے۔

پھر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان آئندہ چند سالوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ وہ فراہمی غذا میں کسی دوسرے ملک کا محتاج نہ رہے۔ یہ بھی ناممکن نہیں کہ صنعتی حیثیت سے وہ روس و امریکہ کی سطح پر پہنچ جائے اور علمی نقطہ نظر سے بھی بہت سے افلاطون و ارسطو پیدا کر لے لے۔ لیکن وہ ایک چیز جسے ذہنی امن و سکون کہتے ہیں اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب خدا، بھگوان اور پریشور کو توڑ پھوڑ کر ایک کر دیا جائے یا ان سب کو مٹا دیا جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں کون سی بات زیادہ آسان ہے، غالباً کوئی نہیں اور اس لئے ہندوستان میں ذہنی اتحاد کی توقع رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

لطف یہ ہے کہ یونٹو ایک ہندو مہا برہمن اور ایک مسلم صوفی بھی کہتا یہی ہے کہ خدا، پریشور اور بھگوان سب ایک ہیں، لیکن ایک کو وہ نظر آتا ہے صرف مندر میں، اور دوسرے کو صرف مسجد میں۔ نہ اسے اذان کی آواز سننے کی تاب نہ اسے صدائے ناقوس کی۔

حیرت سوخت کہ ہمارا یہ گوشم آہ
صوت زنجیر در کعبہ بہ بانگ جبر سے

معلوم نہیں یہ کس وقت کی باتیں ہیں۔

اس کے حقیقی اسباب کیا ہیں؟ اس گفتگو کا یہ محل نہیں اور نہ میرا مقصود اس وقت کوئی مذہبی بحث چھیڑنا ہے۔ بلکہ مرعائون یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب ہندوستانی آبادی ذہنی طور پر اس طرح ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہے، تو صرف جذبہ وطنیت کیونکر ان سب کو اجتماعی حیثیت سے ایک مرکز پر اکٹھا کر سکتا ہے اور وہ جذبہ وطنیت کو مذہب پر کیوں ترجیح دینے لگے۔

اس میں شک نہیں جس حد تک آئین کا تعلق ہے، ہندوستان کی حکومت کا خود کوئی مذہب نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ "لامذہب" یا منکر مذہب ہے بلکہ یہ کہ وہ تمام مذاہب کے شعائر و رسوم کا ماننے والا ہے اور یہ کہہ کر اس نے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اتنی آنکھوں میں اپنے آپ کو مبتلا کر دیا کہ قیامت تک ان سے رہائی پانا آسان نہیں۔

ہندوستان میں اس وقت دو بڑے مذہب رائج ہیں، ایک اسلام، دوسرا ہندو (گویہ کوئی مذہب نہیں بلکہ صرف روشن نظام ہے) اور یہ دونوں بہ لحاظ مروجہ عقاید و شعائر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن یہ اختلاف اگر صرف عقاید کا ہوتا تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن چونکہ اس میں جذبہ مذہبی تفوق بھی شامل ہو گیا ہے اس لئے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے کی جگہ ان میں مغایرت و منافی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور جب تک یہ جذبہ دور نہ ہو، دونوں کا اتحاد ممکن نہیں۔ کہنے کو تو یہ سب کہتے ہیں کہ دونوں ایک قوم ہیں اور واقعتاً وہ ہیں بھی، لیکن ہم خیال نہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ پھر ایسی صورت میں یہاں کسی ایسے اتحاد کی توقع رکھنا جو دوسرے ہم خیال آبادی رکھنے والے ملکوں میں پائی جاتی ہے، بالکل بے معنی سی بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک جمہوری حکومت کا انتہائی نصب العین یہی ہونا چاہئے کہ وہ ہر طبقہ کے جذبات و داعیات کی رعایت ملحوظ رکھے، لیکن جب طبقاتی جذبات کی رعایت ہی تضادم کا باعث ہو تو پھر وہ کیا کرے؟ یہ بڑا مشکل سوال ہے۔

اکابر سیاست کا خیال ہے کہ اس دشواری کو دور کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اکثریت و اقلیت کے تناسب کے نظر انداز کر کے سب سے پہلے اقلیت کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنا چاہئے، یعنی ارباب حکومت کو کوئی قدم ایسا نہ اٹھانا چاہئے کہ اقلیت پر سوچ سکے کہ اس پر فلاں پابندی محض اکثریت کی رعایت سے عاید کی گئی ہے اور اکثریت کو اس پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ لیکن چونکہ حکومت نام خود اکثریت کے برسر اقتدار ہونے کا ہے اس لئے یہ نظریہ اس وقت تک قابل عمل نہیں، جب تک خود اکثریت میں یہ جذبہ

پیدا نہ ہو اور موجودہ طبقاتی احساس کو دیکھتے ہوئے اس کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔

ہندوستان یقیناً آزاد ہو چکا ہے لیکن اس آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ انگریز کا غلام نہیں رہا، ذہنی حیثیت سے وہ بدستور غلام چلا آرہا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو طبقاتی عصبیت میں مبتلا ہو کر اس کی ذہنی غلامی کہیں زیادہ شدید و وسیع ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ (ہندو مسلم تفریق کو چھوڑنے) خود انھیں جماعتوں میں جو اپنے آپ کو ہندو کہتی ہیں، اختلاف پیدا ہو چلا ہے۔

آسام، بنگال، گجرات، پنجاب میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کوئی معمولی بات نہیں اور اگر کانگریس حکومت نے اس باب میں دور اندیشی سے کام نہ لیا تو وہ ہندوستان اپنی سالمیت کو مشکل ہی سے قائم رکھ سکے گی۔

ایک قومی نظریہ اپنی جگہ درست ہے، لیکن اگر خود قوم ہی میں طبقاتی اختلاف پیدا ہو جائے تو پھر ایک قومی نظریہ کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ صورت اور زیادہ اندیشہ ناک ہو جاتی ہے۔

بظاہر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس اختلاف کا بڑا سبب زبان اور رسم خط کا اختلاف ہے اور کوئی صوبہ حکومت کی مقرر کی ہوئی قومی زبان کو وہ اس حد تک اپنے اوپر مسلط دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ وہ اس کی مادری زبان کی ترقی میں حائل ہو۔ یہ خواہش بالکل فطری خواہش ہے اور اس میں شک نہیں کہ حکومت بھی اس کی مخالف نہیں، لیکن حکومت کی غلطی قومی زبان کے مسئلہ میں یہ ہے کہ اس نے بہت زیادہ عجلت سے کام لیا اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ زبان کی تشکیل و ترویج کوئی ایسی چیز نہیں کہ اسے کسی خاص سانچے میں ڈھالا اور نکال لیا، بلکہ وہ ایک کھجور کا سادرخت ہے جس کو بڑھتی ہے ایک نسل اور اس سے فائدہ اٹھاتی ہے دوسری نسل۔ اپنی جگہ یہ بالکل درست ہے کہ اصولاً سارے ملک کی زبان ایک ہونا چاہیے لیکن اس خیال کی تکمیل کے لئے جو راہیں سوچی گئیں وہ صحیح نہ تھیں۔

ضرورت تھی کہ پہلے ہندی کی ترویج کی ابتدا صرف مدارس سے کی جاتی، یعنی چھوٹے درجوں سے شروع کر کے آہستہ آہستہ کالجوں اور یونیورسٹیوں تک پہنچایا جاتا۔ اسی رفتار سے آہستہ آہستہ اسے دفاتر میں لایا جاتا اور جب تک پورے ملک کی ذہنیت اسے قبول نہ کر لیتی، ہر صوبہ کی مروجہ زبان کو اس کے اپنے موقف پر بدستور قائم رکھا جاتا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ جس زبان کو ہندی زبان کہا گیا وہ عوام کی زبان نہ تھی بلکہ ان ریشیوں، منیوں کی زبان تھی جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف عوام میں بددلی پیدا ہوئی اور دوسری طرف خود حکومتوں کے کاموں میں حرج واقع ہونے لگا، کیونکہ اس نئی زبان کو سمجھ کر لکھنا، لکھ کر سمجھنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ ہر چند بعد کو حکومت نے اس دشواری کو محسوس کر کے آسان ہندی لکھنے کی ہدایات جاری کر دیں لیکن اس کا کوئی معیار قائم نہیں کیا اور الجھن دور نہ ہوئی۔

اگر اول اول صوبوں کی مروجہ زبان کو بڑے بغیر صرف ان کا رسم خط ہندی کر دیا جاتا اور بعد کو رفتہ رفتہ اس میں ہندی کے سہل و آسان الفاظ شامل کئے جاتے تو شاید لسانی اختلافات کا رد عمل وہ نہ ہوتا جو اس وقت نظر آرہا ہے۔

جن حضرات کو میرے خیالات سے اختلاف ہو وہ مفصل و مدلل طور پر مجھے لکھ بھیجیں، میں انکی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کروں گا اگر انھوں نے میری غلط فہمی مجھ پر ثابت نہ کر دی۔

احمدی جماعت کے متعلق

پاکستان کے خریدار

نگار کا سالانہ چندہ دس روپیہ ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر بھیج کر رسید ڈاک خانہ یہاں بھیج دیں۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ولیسٹ کراچی

نیچر نگار لکھنؤ

عہد اورنگ زیب کی ایک اہم تاریخی دستاویز

(سترھویں صدی کے ایک فرانسیسی سیاح کے تاثرات)

(پروفیسر خلیق احمد نظامی)

سترھویں صدی میں یورپ کے مختلف ممالک سے کثیر تعداد میں سیاح ہندوستان آئے اور اپنے تاثرات کو سفر ناموں، خطوط، یادداشتوں یا عرضداشتوں کی شکل میں قلمبند کیا۔ لیکن اس دور کے کسی سیاح نے ہندوستان کے حالات کا اتنا تفصیلی اور گہرا جائزہ نہیں لیا جتنا کہ مشہور سیاح برٹے (Bernier) نے لیا تھا۔ وہ تقریباً چودہ سال تک یہاں رہا اور کشمیر سے لے کر گولکنڈہ اور سورت سے لے کر قاسم بازار تک ہر جگہ گھوما۔ کبھی لال قلعہ سے ملک کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیا، کبھی بنگال کے تجارتی مرکزوں میں بیٹھ کر ہندوستان کی اقتصادی حالت پر نظر ڈالی۔ یہاں کی گرمی سے گھبرا کر کشمیر کے دل فریب مناظر میں پہنچا تو بے اختیار کچھ اٹھا:۔ ”میں کشمیر پر فریفتہ ہو گیا ہوں۔“ جب پہلے پہل دہلی میں شہنشاہان، نصیراں اور نقارے بکتے سنا تو کہنے لگا: ”اس شور سے تو کان بہرے ہوئے جاتے ہیں۔“ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ان سے اتنا مانوس ہو گیا کہ لکھا:۔ ”رات کو جب اپنے مکان کی چھت پر لیٹ کر اس کی آواز سنتا ہوں تو بہت بھلی اور سہلی معلوم ہوتی ہے۔“

ہندوستان کو قریب سے دیکھنے اور اس کو سمجھنے کا جذبہ برٹے کو جگہ جگہ لے گیا۔ امرا کی مجالسوں میں پہنچا، نانہائیوں کی دوکانوں پر بیٹھا، سورج گرہن کے میلوں میں شریک ہوا، جوگیوں، اور فیروں سے باتیں کیں، بنارس میں پنڈتوں سے ملا، پیر خجال میں درویشوں سے ملاقات کی، اشکریوں کے حالات کی ٹوہ لگائی، ایک عورت کو سستی ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے دوپہر میں بھاگا بھاگا بھرا، ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھنے کی جستجو ہوئی تو خود اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیا، جغرافیائی حالات کی تحقیق کا خیال پیدا ہوا تو کشمیر کے چشموں تک جان پہنچا غرض سیاسی، سماجی، اور اقتصادی زندگی سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر اس کی نظر نہ لگتی ہو۔

برٹے ۱۶۷۲ء میں فرانس میں شہر انجو کے ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۶۵۲ء میں اس نے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری حاصل کی۔ فرانس کے مشہور فلسفی گیسندی نے اس کی تربیت اور ذہنی نشوونما میں خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا۔ ۱۶۵۳ء میں

بہ فاضل مقالہ نگار نے ہر جگہ برٹے کے بجائے برٹے لکھا ہے جو فرانسیسی تلفظ کے لحاظ سے یقیناً درست ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پابندی ضروری نہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے یہاں برٹیر کے نام سے مشہور ہو چکا ہے اور اسی نام سے اسے پکارنا چاہئے جس طرح لفظ *Mach* کا تلفظ دراصل پرسی ہے لیکن سب اس کو پرسی کہتے ہیں۔ عربی میں بھی غیر زبانون کے الفاظ کے تلفظ میں حروف کتبوی ہی کو سامنے رکھتے ہیں۔ مثلاً ”مکناہ“ کا تلفظ فرانسیسی میں ٹوٹی ہے لیکن عربی میں ہمیشہ اسے ”ٹوٹیس“ ہی لکھیں گے۔ (نیاز)

برتنے مشرقی ممالک کو دیکھنے اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کی نیت سے نکل کھڑا ہوا۔ تین چار سال تک شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں گھومتا رہا۔ اور بالآخر ۱۹۵۸ء میں بندرگاہ سوہرت پر آپہنچا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب شاہ جہاں کے بیٹوں میں خانہ جنگی کا بازار گرم تھا اور داراشکوہ جب ناکام ہو کر گجرات کی طرف بھاگا تو راستہ میں اتفاقاً برتنے سے ملاقات ہو گئی۔ خود لکھتا ہے :-

”عجیب و غریب اتفاق تھا کہ میں اُسے راستہ میں مل گیا اور چونکہ کوئی طبیب اُس کے ہمراہ نہ تھا، اس لئے مجھے جبراً اپنے ساتھ لے لیا۔“ (ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۹)

چند دن داراشکوہ کے ساتھ رہنے کے بعد برتنے دہلی آگیا اور یہاں اورنگ زیب کے مشہور امیر دانش مند خاں کے طبیعوں میں شامل ہو گیا۔ برتنے کو اس کی صحبت میں فرانس کی علمی مجلسوں کا لطف آگیا۔

دانش مند خاں کی مجلسوں میں برتنے کو نہ صرف امراء کے اندرونی حالات کا جائزہ لینے اور مختلف حکام سے ملنے کا موقع ملا۔ بلکہ ہندوستان کے مختلف مذہبی فرقوں کے اعتقادات اور ان کی مذہبی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی سہولتیں بھی میسر آئیں۔ اس لئے کہ دانش مند خاں کو خود مذاہب کی تحقیق کا بڑا شوق تھا۔ سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برتنے نے بعض اہم سیاسی واقعات کا ذاتی مشاہدہ کیا تھا۔ جس وقت داراشکوہ امتہائی کس میرسی اور بے چارگی کے عالم میں گجرات اور سندھ کی طرف بھاگا بھاگا پھر رہا تھا، برتنے نے چند دن قریب رہ کر اس کا حال دیکھا تھا۔ لکھتا ہے کہ دارا پر ایسی مفلسی کا عالم تھا کہ خیمہ تک اس کے پاس نہ تھا۔ اُس کی بیگم اور عورتیں صرف ایک قنات کی آڑ میں تھیں جس کی رسیاں میری سواری کی پہلی کے پیروں سے بندھی ہوئی۔ (ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۹)۔ پھر جب داراشکوہ گرفتار کر کے دہلی لایا گیا اور ذلت کے ساتھ دہلی کے بازاروں میں اس کو گشت کرایا گیا، اس وقت بھی برتنے وہاں موجود تھا۔ لکھتا ہے :-

”میں بھی شہر کے سب سے بڑے بازاروں میں ایک اچھے موقع پر اپنے دو رفیقوں اور دو خدمت گاروں کے ساتھ عمدہ گھوڑے پر چڑھا کھڑا تھا اور ہر طرف سے رونے اور چلانے کی آوازیں آرہی تھیں اور مرد اور بچے اس طرح چلا چلا کر رہے تھے کہ گویا ان پر کوئی بڑی ہی مصیبت پڑی ہے۔“ (ج ۱ ص ۱۸۸-۱۸۹)

جس وقت شہزادہ سلیمان شکوہ کو ہتھکڑیاں پہنا کر اورنگ زیب کے سامنے لایا گیا، اس وقت بھی برتنے دربار میں موجود تھا۔ اور نہایت تعجب کے ساتھ اُس نے اس منگامہ کو دیکھا تھا۔ (ج ۱ ص ۱۹۴-۱۰۵)۔ خانہ جنگی کے خاتمہ پر اورنگ زیب نے جوشن کیا تھا، اس میں برتنے نے بھی شرکت کی تھی۔ لکھتا ہے کہ ”اس سے بڑھ کر کوئی تماشہ میں نے عمر بھر کبھی نہیں دیکھا۔“

(ج ۲ ص ۲۸۸، ص ۲۸۹)

ہندوستان کے شہر برتنے کی نظر میں برتنے نے مشرق و مغرب کے بے شمار شہروں کی سیر کی تھی۔ اُس نے نئے شہروں نے اس میں ایسی بصیرت پیدا کر دی تھی کہ وہ ظاہری شان و شوکت سے دھوکا کھائے بغیر شہروں کے سماجی اور اقتصادی توازن کا جائزہ لے لیتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے شہروں کو دیکھ کر اس نے لکھا:

”یہاں کے شہر درقصبے خواہ اس وقت خستہ حال اور دیوانہ ہوں، مگر ایسا شہر کوئی نہیں ہے جس میں جلد تباہ اور خراب ہو جانے کی علامتیں نہ ہوں۔“ (ج ۱ ص ۳۰۴-۳۲۴)

برتنے نے جن اسباب کی بنا پر یہ رائے قائم کی تھی ان کی پوری تشریح تو نہیں کی ہے لیکن یہ ضرور کہا ہے کہ شخصی حکومت کے خراب

اشارات جب ظاہر ہوتے ہیں تو شہروں پر تباہی آجاتی ہے۔ شہری زندگی پر بادشاہ کی موجودگی اور غیر موجودگی کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ لاہور کے متعلق لکھتا ہے:-

”چونکہ میں برس سے زیادہ عرصہ سے بادشاہ مع امراء دربار آگرہ یا دہلی میں رہتا ہے اس لئے لاہور کے اکثر مکانات حالت ویرانی میں ہیں، بلکہ واقعتاً بہت سی عمارتیں بالکل منہدم ہو گئی ہیں۔ اور پچھلے چند برسوں کی شدید بارشوں میں بہت سے باشندے بھی مکانات میں دب کر مر چکے ہیں۔ گمراہ تک بھی چار پانچ بازار بہت بڑے ہیں جن میں سے دو تین تو طول میں دو میل سے بھی متجاوز ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی اکثر مکانات بالکل ڈھنڈے پڑے ہیں۔“

(ج ۲ ص ۲۸ - ۲۷ - ص ۳۸۴)

برتنے نے اپنے سفرنامہ میں متعدد موقعوں پر یہ بات کہی ہے کہ شہروں کی آبادی کا انحصار بادشاہ یا امراء کی موجودگی پر ہے۔ اس سے علیحدہ ان کے وجود کو سوجا ہی نہیں جاسکتا۔ دہلی کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

”اس ملک کے دارالحکومت یعنی شہر آگرہ یا دہلی کے باشندوں کی معاش کا بڑا دار و مدار صرت فوج کی موجودگی پر ہے اور اس لئے وہ مجبور ہیں کہ جب کبھی بادشاہ کوئی ایسا سفر اختیار کرے تو وہ بھی ساتھ جائیں۔“

(ج ۱ ص ۳۹۵، ص ۲۲۰)

ایک اور موقع پر لکھتا ہے:-

”دہلی کی تمام خلقت حقیقتاً لشکر میں شامل ہے کیونکہ ان کے کام کاج اور گزران، بادشاہ اور لشکر ہی پر منحصر ہے اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو لشکر کے ساتھ جائیں یا دہلی میں پڑے بھوکے مریں۔“

(ج ۲ ص ۲۲ - ص ۳۸۱)

برتنے جس وقت دہلی پہنچا تو شاہجہاں کی دہلی، شاہ جہاں کو آباد ہوئے چوتھائی صدی سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ یہاں رہ کر سب سے پہلے اس نے جس بات کو محسوس کیا وہ یہ تھی کہ دہلی میں کوئی درمیانی طبقہ نہیں ہے۔ یہاں یا تو لوگ بہت مالدار ہیں یا بہت غریب۔ مکانات یا تو نہایت عالی شان ہیں یا محض چھپر ہیں جن میں فوجی یا معمولی پیشہ ور لوگ رہتے ہیں۔ اوسط درجہ کے مکانات کا یہاں کوئی پتہ نہیں۔

امراء کے مکانات کے متعلق لکھتا ہے کہ:- ”عام طور پر ہوا دار خوشنما ہوتے ہیں۔ ہر مکان میں وسیع صحن اور خوبصورت باغیچے ہیں۔ صدر والان کے اندر اور دروازوں میں اکثر چھوٹے چھوٹے فوارے چلتے رہتے ہیں۔ گرمی میں استعمال کے لئے تہ خانے اور خس خانے بنانے کا رواج ہے۔ لکھتا ہے کہ تہ خانوں کی نسبت اکثر لوگ خس خانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ خس خانے چین کے اندر حوض کے قریب بنائے جاتے ہیں تاکہ خدمت گار ڈولوں سے ان پر پانی چھڑکتے رہیں۔ (ج ۲ ص ۲۶۱ - ص ۲۴۷)

نشست کے لئے صدر والان میں روئی کا موٹا گدیا بچھا یا جاتا ہے۔ گرمی کے دنوں میں اس پر چاندنی، جاڑوں میں ریشمیں قالین بچھتے ہیں۔ صاحب خانہ یا مخصوص جہانوں کے لئے بیچ میں خوبصورت گدیے ہوتے ہیں جن پر عموماً سنہری زری کی دھاریاں بنی ہوتی ہیں۔ کم خواب اور مغل کے گادے اس پر لگا دئے جاتے ہیں۔ طاقتوں میں مہینی کے برتن اور گلدان سجائے جاتے ہیں۔ اس صدر والان کی چھت نقش و نگار سے مزین ہوتی ہے۔ (ج ۲ ص ۲۶۲ - ص ۲۴۷ - ۲۴۸)

خس پوش مکانات بھی خاصے سلیقے سے بنائے جاتے ہیں۔ لمبے اور مضبوط باسوں کے چھپر چھا کر نہایت عمدہ کھنگل اور سفیدی کردی جاتی ہے (ج ۲ ص ۲۶۰ - ص ۲۴۶)۔ ان چھپروں میں آگ لگنے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔ خود برتنے کی موجودگی میں ایک بار ان مکانوں میں آگ لگی اور تقریباً ساٹھ ہزار چھوٹے جل کر خاکستر ہو گئے۔ لکھتا ہے کہ اس حادثہ میں جانوروں کے علاوہ کچھ عورتیں بھی

جل گئیں کیونکہ پردہ کی پابندی کے باعث وہ جلدی سے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔
 ان خاص پوش مکانوں کی کثرت کو دیکھ کر برتنے نے دہلی کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ بڑی دلچسپ ہے۔ لکھتا ہے :-
 ”ان کچے خاص پوش مکانوں کے باعث میں ہمیشہ یہ خیال کرتا ہوں کہ سوائے اتنے فرق کے کہ آرام کے بعض سامان اس میں

زیادہ ہیں، دہلی کو یاد دہات کا مجموعہ یا فوج کی چھاؤنی ہے۔“ (ج ۲ ص ۲۶۰ - ص ۲۶۶ - ۲۶۷)

قلعہ کی زندگی برتنے نے اپنے سفرنامہ میں قلعہ کی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی معلومات کچھ تو ذاتی مشاہدے پر مبنی تھی اور کچھ اس نے خواجہ سراؤں اور شاہی ملازمین کے ذریعہ حاصل کی تھی۔
 لکھتا ہے کہ قلعہ کے دو اہم حصے ہیں، محل اور محل سرا۔ محل سرا کے حالات کا پتہ لگانا محال ہے۔ وہاں کسی شخص کا گزر ممکن نہیں، فوجیوں میں ایک مثل مشہور ہے کہ تین موقعوں سے بچنا اور احتیاط کرنا چاہئے۔ کوتل گھوڑوں سے، شکار گاہ سے اور محل سرا یا بیگمات شاہی کی سواری کے قریب جانے سے۔ (ج ۲ ص ۳۵ - ص ۳۷)

قلعہ کے دروازہ پر دو ہاتھی نصب تھے، جن پر راجہ جے مل اور اس کے بھائی کے مجسمے تھے۔ لکھتا ہے :- ”یہ ہاتھی جن پر یہ دونوں بہادر سوار ہیں، بڑے شان و شکوہ کے ہیں اور ان کو دیکھ کر رعب اور ادب کا ایک ایسا خیال مجھ پر چھا گیا، جس کو میں بیان نہیں کر سکتا“ (ج ۲ ص ۳۷ - ص ۳۸)۔ اس دروازہ سے قلعہ میں داخل ہو کر ایک وسیع راستہ ملتا ہے جس کے وسط میں ایک نہر جاری ہے۔ اس نہر کے دونوں جانب ایک چبوترہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر دونوں طرف آخر تک محراب دار دالان بنے ہوئے ہیں۔ ان دالانوں میں کارخانوں کے داروغہ اور کم درجہ کے عہدہ دار اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ جو منصب دار رات کو چوکی دینے آتے ہیں وہ اس چبوترے پر ٹھہرتے ہیں۔

قلعہ کے دوسرے دروازے سے بھی اندر داخل ہونے پر ایک خاصی چوڑی سڑک پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سڑک کے دونوں جانب چبوترے تو دیے ہی ہیں لیکن دالانوں کی جگہ دوکانیں بنی ہوئی ہیں۔ ان دو بڑی سڑکوں کے علاوہ جو قلعہ کے دروازوں تک جاتی ہیں، چھوٹی چھوٹی اور بھی متعدد سڑکیں ہیں۔ یہ سڑکیں ان مکانات تک جاتی ہیں جو امرائے چوکی دینے کے موقع پر اپنے آرام کے لئے بنائے ہیں۔ چوکی دینے کے لئے امراء کی بارہاں مقرر ہیں۔ باری باری وہ آکر قلعہ میں رات بھر سپردہ دیتے ہیں۔ یہ دیوان خانوں کے طرز کے مکانات ہیں جن کے سامنے پائچے، حوض اور فوارے لگے ہوئے ہیں۔ امراء اپنے خرچ سے ان دیوان خانوں کو آراستہ پیراستہ رکھتے ہیں۔ جس امیر کی چوکی ہوتی ہے اس کے لئے کھانا خاصے سے آتا ہے۔ جس وقت کھانے کے خوان آتے ہیں وہ امیر محل کی طرف رخ کر کے تین دفعہ آداب بجا لاتا ہے۔ امراء کے ان دیوان خانوں کے علاوہ محل کے اندر سرکاری دفتروں کے لئے بھی دیوان خانے بنے ہوئے ہیں۔

محل میں کارخانے بھی ہیں جن میں صبح سے شام تک چکن دوز، مصور، نقاش، درزی، موچی، جولاہے وغیرہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

ان دیوان خانوں اور دفتروں سے گزرنے کے بعد خاص و عام، تک رسائی ہوتی ہے۔ یہ ایک وسیع مربع مکان ہے جس کے چاروں طرف محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ سامنے ایک بڑا بالاد ہے جس پر نفیریاں، شہنائیاں اور نقارے رکھے ہیں۔ اس نقارخانہ سے گزر کر ایک دالان میں پہنچتے ہیں۔ اس دالان کے ستونوں پر اور چھت پر سنہری نقش و نگار ہیں۔ اس دالان کی کرسی بہت اونچی ہے اور وہ تین طرف سے کھلا ہوا ہے۔ ایک دیوار کے وسط میں جو محل سرا سے اس کو ملتا ہے، وہاں ایک بڑا ”شہ نشین“ بنا ہوا ہے۔ دہلی کا بادشاہ یہاں آکر بیٹھتا ہے۔ دائیں بائیں شہزادے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ فاصلہ چھوڑ کر چاندی کا جنگلہ ہے جس میں امراء، راجا اور غیر ملکوں کے سفیر کھڑے ہوتے ہیں، ان سے جو جگہ باقی بچتی ہے اس میں رعایا کا ہر کس و نا کس آکر کھڑا ہو سکتا

ہے۔ عموماً یہ جگہ بلکہ پورا صحن اُن لوگوں سے بھرا رہتا ہے جو مختلف قسم کی عرضیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو "خاص و عام" کہتے ہیں۔ (ج ۲ - ص ۲۸۰ - ص ۲۹۱)۔ یہاں ڈیڑھ دو گھنٹے تک لوگوں کے سلام اور مجرا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر گھوڑے اور ہاتھی پیش کئے جاتے ہیں۔ ہاتھیوں کو ہلا کر اُن کے جسم پر کالا رنگ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اُن کی سونڈ پر لال خطا کھینچ دئے جاتے ہیں۔ تبت سے سفید مسروالی گالیوں کی دُمیں بڑی قیمت پر خریدی جاتی ہیں اور اس طرح ان ہاتھیوں پر لٹکائی جاتی ہیں کہ دو بڑی موچھیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ہاتھی زربفت کی جھولیں لٹکائے، چاندی کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے گزرتے ہیں اور جب تخت کے قریب پہنچتے ہیں تو سونڈ اٹھا کر چنگھاڑتے ہیں۔ یہ اُن کی سلامی سمجھی جاتی ہے۔ پھر گھوڑے، بہرن، تیل گاٹیں، گنڈے، ہنگال کے بھینسے اور دوسرے جانور پیش کئے جاتے ہیں۔ بخارا وغیرہ سے لائے ہوئے رنگ کی جھولیں ڈالے ہوئے سامنے سے گزرتے ہیں۔ آخر میں ہر قسم کے شکاری پرند لائے جاتے ہیں۔ ان تمام ہنگاموں کے بعد بادشاہ نہایت توجہ کے ساتھ سواروں کو ملاحظہ کرتا ہے۔ برائے کا بیان ہے:-

"جب سے لڑائی بند ہوئی ہے کوئی سوار باپیدل ایسا نہیں جس کو بادشاہ نے چشم خود نہ دیکھا ہو اور اس کے

اپنی واقفیت حاصل نہ کی ہو۔ چنانچہ اس نے کسی کی تنخواہ بڑھا دی، کسی کی کم کردی اور کسی کو بالکل ہی موقوف

کر دیا۔" (ج ۲ - ص ۲۸۲ - ص ۲۹۳)

اس کے بعد لوگ عرضیاں پیش کرتے ہیں۔ یہ عرضیاں تمام و کمال بادشاہ کے ملاحظہ اور سماعت میں آتی ہیں۔ بادشاہ خود دریافت حال کرتا ہے اور معاملات کی تحقیق میں دلچسپی لیتا ہے۔ ان مستغنیوں میں سے جن لوگوں کے معاملات زیادہ تحقیق طلب اہل قابل غور ہوتے ہیں ان کی عرضیاں الگ کردی جاتی ہیں۔ ہفتہ میں ایک دن بادشاہ تخلیہ میں ان لوگوں کی عرضیاں سنتا ہے۔ اس موقع پر ان عرضیوں کو پیش کرنے کا کام ایک مسن اور دولت مند شخص کے سپرد کر دیا جاتا ہے، عدل و انصاف میں بادشاہ کی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے برائے لکھتا ہے:-

"اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ ایشیائی بادشاہ جن کو اہل یورپ جاہل اور ناتراشیدہ خیال کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ہی

اپنی رعایا کی داد دہی اور انصاف رسانی سے جو ان پر واجب ہے، غفلت نہیں کرتے۔" (ج ۲ - ص ۲۸۳ - ص ۲۹۳)

دربار میں خوشامد کا ماحول رہتا ہے۔ جو لفظ بھی بادشاہ کی زبان سے نکلتا ہے درباری اس پر عجیب انداز سے اظہار تحسین کرتے ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر وہ "کرامات" "کرامات" پکارتے ہیں۔ خوشامد کی عادت پوری سوسائٹی میں سرایت کر گئی ہے۔ لکھتا ہے کہ جب کوئی امیر مجھے علاج کے لئے بلاتا ہے تو پہلے یہ کہتا ہے کہ آپ تو آپے وقت کے ارسطو، بقراط اور بوعلی سینا ہیں۔ (ج ۲ - ص ۲۸۳ - ص ۲۹۴)

"عام و خاص" کے بڑے دالان کی بغل میں ایک "خلوت خانہ" ہے جسے "غسل خانہ" کہتے ہیں۔ اس پر نہایت خوبصورت سنہری روغن ہے۔ یہاں ایک اونچی کرسی پر بیٹھ کر بادشاہ امراء اور صوبہ داروں کی عرضیاں سنتا ہے۔ یہاں چند مخصوص لوگوں کے سوا کوئی حاضر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح صبح کو "خاص و عام" کے دربار میں حاضر ہونے پر امراء کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے یہاں شام کو غیر حاضری پر سزا ملتی ہے۔ البتہ دانش مند خاں کے علمی ذوق کے پیش نظر بادشاہ نے ان کی غیر حاضری معاف کر دی ہے۔ لیکن چہار شنبہ کو جو ان کی چوکی کا دن ہے اُن کو بھی اور امراء کی طرح محل میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔

محل سرا کے حالات کے متعلق برائے نے خواجہ سراؤں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں بیگمات کے لئے حسب مراتب علیحدہ علیحدہ محلات ہیں جن کے دروازوں کے سامنے حوض، باغیچے، روشیں، فوارے لگے ہوئے ہیں۔ دربار کی طرف ایک چھوٹا سا برج ہے جس کا رنگ لاجوردی ہے اور بڑے بڑے آئینے چاروں طرف لگے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ برائے کو بڑی بیگم کے علاج کے سلسلہ میں محسرا میں

بلا گیا۔ بیگم شدید علی تھیں اور باہر کے دروازے تک آنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ برتنے کو اندر لے جایا گیا لیکن اس طرح سے کہ ایک کشمیری شال سر سے پاؤں تک اس پر ڈھک دی گئی اور ایک خواجہ سرا اندر سے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر تک لے گیا۔ برتنے نے محل کی زندگی کی تفصیلات کے سلسلہ میں مینا بازار کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ کبھی کبھی ایک فرضی بازار لگا کرتا ہے جس میں امراء اور بڑے بڑے منصب داروں کی بیگمات دوکانیں لگا کر بیٹھتی ہیں۔ بادشاہ، بیگمیں اور شاہزادیاں خریدار بنتی ہیں۔ اس میلے کا بڑا لطف یہ ہے کہ ہنسی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسہ کے لئے جھگڑتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ بیگم صاحب بہت گراں فروش ہیں۔ دوسری جگہ اس سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے۔ ہم ایک کوڑی بھی زیادہ نہ دیں گے۔ ادھر وہ کوشش کرتی ہے کہ اپنا مال زیادہ قیمت کو بیچے۔ جب دیکھتی ہے کہ بادشاہ زیادہ قیمت نہیں لگاتا تو گفتگو میں اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ کہہ اٹھتی ہے کہ آپ اور چیزوں کی خبر لیں، ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں۔ یہ آپ کے لائق نہیں ہیں۔ لیکن یہ محض دکھا دینی ہوتا ہے بعد کو بادشاہ اور بیگمات روپیہ کی جگہ اشرفیوں میں چیزیں خریدتی ہیں۔ (ج ۲ ص ۲۹۵-۲۹۶)

دہلی کے بازار اور دوکانیں برتنے کا زیادہ وقت دہلی میں گزرا تھا، اس لئے یہاں کے حالات کو اس نے نسبتاً زیادہ گلی کوچوں میں بے شمار بازار ہیں لیکن بعض بازار اپنی وسعت اور خوبصورتی کی بنا پر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دہلی میں بڑے بازار سات ہیں۔ شہر کے دو بڑے بازار شاہی چوک کے دروازے پر (جو قلعہ سے ملتی ہے) آکر ختم ہوتے ہیں۔ (ج ۲ ص ۲۵۵) ان کا عرض ۲۵، ۳۰ قدم کے قریب ہے اور جہاں تک نظر پہنچتی ہے وہ سیدھے چلے گئے ہیں۔ جو بازار لاہوری دروازہ کو جاتا ہے وہ بہت لمبا ہے اس کے دونوں جانب محراب دار دوکانیں ہیں جن میں بیواری، اہل حرفہ اور صراف اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ دوکانوں کے پیچھے کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں جن میں رات کو سامان بند کر دیا جاتا ہے۔ ان دوکانوں کے اوپر بالا خانے بنے ہوئے ہیں جو بازار کی طرف سے بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ویسے بھی نہایت آرام دہ اور ہوا دار ہیں۔ رات کو بیوپاری انھیں بالا خانوں میں سوتے ہیں۔ (ج ۲ ص ۲۵۸-۲۵۹)

یہ بالا خانے شہر کے ہر بازار میں نہیں ہیں۔ مہتمول بیوپاری دوکانوں یا بالا خانوں پر نہیں سوتے۔ وہ کاروبار سے فارغ ہو کر اپنے اپنے مکانوں کو چلے جاتے ہیں۔ (ج ۲ ص ۲۵۸-۲۵۹)

دوکانوں کے سلسلہ میں برتنے نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہاں ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اگر ایک دوکان میں پٹھانہ، کنخواب اور زری کا سامان رکھا ہے تو پاس ہی کوئی کچیس دوکانوں میں لکھی، تیل، آٹا، چاول وغیرہ فروخت ہوتا ہے۔ صرف بعض جگہ میوؤں کے بازار تو علیحدہ ہیں۔ باقی سب بازار ملے جلتے ہیں۔ بیوپاری اپنا سب مال دوکانوں پر نہیں رکھتے۔ رات کا بیشتر سامان گوداموں میں بند رہتا ہے۔ لیکن حلوائیوں کی دوکانیں کثرت سے ہیں۔ لیکن نہ مٹھائی اچھی بنتی ہے نہ اس کو گرد اور گھیوں سے بچایا جاتا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۶۲-۲۶۳)

دہلی کے بازاروں میں ایک اور چیز برتنے کے لئے جاذب نظر تھی وہ رتالوں، جوتشیوں اور نجومیوں کی کثرت تھی۔ جہاں دیکھئے دھوپ میں میلا سا قالین کا ٹکڑا بچھائے بیٹھے ہیں، علم ریاضی کے کچھ پرانے آلات سامنے سجے ہوئے ہیں، ایک بڑی کتاب جس پر بارہ برجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں، کھلی ہوئی سامنے رکھی ہے اور کثیر تعداد میں عورتیں سفید پادروں میں لپٹی ہوئی ان کے گرد کھڑی ہیں اور اپنے معاملات سے بیان کر رہی ہیں۔ (ج ۲ ص ۲۵۷-۲۵۸/۲۵۹-۲۶۰)

اشیاء خور و نوش برتنے نے کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق اپنے تاثرات مختلف موقعوں پر بیان کئے ہیں۔ دہلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں نان بائی بے شمار ہیں لیکن ان کے تنور فرانسسیسی تنوروں سے مختلف ہیں اور بہت بڑے۔

(ج ۲ - ص ۲۶۳ - ص ۲۵۰) نان باٹیوں کی پکائی ہوئی روٹی اچھی سکی ہوئی نہیں ہوتی۔ البتہ قطعہ میں روٹی کسی قدر اچھی پکتی ہے اس میں دودھ، مکھن اور انڈا خوب ڈالا جاتا ہے۔ بازاروں میں مختلف قسم کے کباب اور قلیے بکتے ہیں لیکن گوشت کے متعلق شک ہی رہتا ہے کہ کس جانور کا ہے۔ لکھتا ہے:-

”مجھے معلوم ہے کہ کبھی کبھی اونٹ یا گھوڑے یا قریب المرگ بیل کا گوشت بھی استعمال کر لیتے ہیں۔“

(ج ۲ - ص ۲۶۵ - ص ۲۵۰)

اسی بنا پر برٹن نے یہ رائے قائم کی تھی کہ ہندوستان میں جو کھانا گھر پر تیار نہ ہوا ہو وہ معین صحت نہیں ہو سکتا۔ خود اس کے لئے کھانے کا اہتمام کرنا مشکل تھا اس لئے اس نے ایک عجیب ترکیب نکالی۔ شاہی باورچی خانہ کے داروغہ سے اس نے معاملہ کر لیا چنانچہ روز اپنا نوکر وہاں بھیج کر کھانا منگا لیتا تھا۔ کھانے کی قیمت تو اسے کچھ زیادہ ادا کرنی پڑتی تھی لیکن کھانا بہت اعلیٰ درجے کا حاصل ہو جاتا تھا۔ دانش مند خاں کو جب اس کا علم ہوا تو بہت ہنسنا اور اس کی چوری اور چالاکی پر تعجب کا اظہار کیا۔ برٹن نے جواب دیا کہ اگر ایسا نہ کرتا تو فاتوں سے مر جاتا، اس لئے کہ ڈیڑھ سو اشرفی ماہانہ جو آپ کی سرکار سے ملتے ہیں میرے لئے کافی نہیں۔ حالانکہ فرنگوں میں ایک بادشاہ کا سا کھانا کھا سکتا ہوں۔ (ج ۲ - ص ۲۶۶ - ص ۲۵۱)

شراب دہلی کی کسی دوکان پر بیچ میں ملتی۔ اگر کہیں عمدہ شراب ملتی ہے تو وہ شیراز وغیرہ کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ باہر کی آئی ہوئی شرابیں بے حد گراں ہیں۔ ہندوستانی کہتے کہ ان کی قیمت اس کے مزے کو بے لطف کر دیتی ہے (ج ۲ - ص ۲۶۸ - ص ۲۵۳)۔ ہندوستان کی بنی ہوئی شراب ”عرق“ کہلاتی ہے۔ یہ بہت تمیز اور تند ہوتی ہے اس کے پکے پر ممانعت ہے۔ عیسائیوں کے سوا کوئی شخص علاوہ شراب نہیں پی سکتا۔

گنگا کا پانی پینے کے لئے دور دورے جاتے ہیں۔ برٹن جب دانش مند خاں کے ساتھ کشمیر گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے امراء نے گنگا جل اونٹوں پر لاد کر ساتھ لے لیا ہے۔ خود اورنگ زیب کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے چار حیمے ایسے ہوتے تھے جن میں پھل اور گنگا جل رکھا جاتا تھا۔

زراعت لکھتا ہے کہ ہندوستان کا زیادہ حصہ نہایت زرخیز ہے (ج ۱ - ص ۳۶۸ - ص ۴۰۲)۔ لیکن زراعت کے طریقے ناقص اور خراب ہیں۔ قابل زراعت زمین کا بڑا حصہ کاشتکاروں کی قلت کے باعث خالی پڑا ہے۔ (ج ۱ - ص ۳۷۲ - ص ۴۰۵)۔ حکام کی بدسلوکی اور ظالمانہ برتاؤ نے کاشتکاروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ چنانچہ کاشتکاروں میں زراعت چھوڑ کر شہر میں ملازمت تلاش کرنے کا رجحان ترقی کر رہا ہے۔ یہ پریشان اور مفلوک الحال کاشتکار شہروں میں آ جاتے ہیں اور فوج میں پانی بھرنے، یا سائیکی کا کام کرنے لگتے ہیں۔ یا پھر جس راجہ کے علاقہ میں ظلم و ستم کم دکھائی دیتا ہے وہاں بھاگ جاتے ہیں۔ (ج ۱ - ص ۴۰۵ و ۴۰۳ - ص ۲۲۶، ۲۰۵)

برٹن نے زراعت کی اس ابتر حالت کا بڑا سبب یہ قرار دیا ہے کہ کاشتکار کو زمین پر حق ملکیت نہیں ہے۔ لکھتا ہے:-

”میں نے یورپ کی حکومتوں کی حالت کا جہاں زمین کا حق ملکیت رعایا کو حاصل ہے اور ان ملکوں کی حالت کا جہاں

یہ حق ان کو حاصل نہیں ہے، احتیاط کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔“ (ج ۱ - ص ۴۰۵، ص ۲۲۶)

برٹن نے ملک کا سب سے زیادہ زرخیز علاقہ بنگال کو قرار دیا ہے۔ لکھتا ہے:-

”بنگال میں دو مرتبہ جانے سے جو واقفیت مجھ کو اس ملک کی نسبت حاصل ہو سکی ہے اس سے مجھ کو یقین ہے کہ جو

فضیلت ملک مقرر سے منسوب کی گئی ہے وہ زیادہ تر بنگال کا حق ہے۔“ (جلد ۲ - ص ۱۲۰ - ص ۴۳۷)

بنگال کے بعد پیداوار کے لحاظ سے برٹن نے کشمیر کی تعریف کی ہے۔ لکھتا ہے کہ یہاں انگور، سن، زعفران، گیہوں، دھان، اور

پیداوار

ترکاریوں کے بہت کھیت ہیں۔ سیب، تاسپاتی، آلوچہ، خوبانی، اخروٹ وغیرہ کے درختوں کی بے حد کثرت ہے۔

مصنوعات برٹن نے ملک کے مختلف حصوں کی مصنوعات کا جائزہ بھی بہت غور سے لیا ہے اور ترقی و تنزل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نے امکانات کی نشاندہی بھی کی ہے اور کمزوریوں اور نقائص کا پتہ بھی دیا ہے۔ لکھتا ہے

کرکٹیر میں کلڑی کا کام نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ وہاں کے بنے ہوئے صندوق، قلمداغ وغیرہ تمام ملک میں جاتے ہیں۔ (ج ۲ - ص ۷۲، ص ۷۳) وارنش کا کام بھی نہایت عمدہ ہوتا ہے۔

مصوروں اور نقاشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اُن کے باریک اور نازک کام کو دیکھ کر اکثر حیرت میں رہ گیا ہوں۔ ایک مصور نے اکبر کی بڑی بڑی مہموں کی تصویر ایک ڈھال پر سات سال میں طیار کی تھی۔ برٹن نے جب اس ڈھال کو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اس تعریف کے باوجود اس نے ہندوستانی مصوروں کی ایک کمزوری کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ یہ مصور انسانی چہرہ کی کیفیات ظاہر کرنے میں کچے ہیں۔ (ج ۲ - ص ۲۷۱ - ص ۲۷۵)۔ لیکن بعض کاریگر اتنے ماہر بھی ہیں کہ اپنے ہاتھ سے ایسی چیزیں طیار کر لیتے ہیں کہ یورپ میں مشین سے بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اصل و نقل میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے، مثلاً یہاں کی بندوقیں بالکل یورپ کی بندوقوں کے مشابہ ہوتی ہیں۔ سونے کے زیور تو اتنے عمدہ طیار ہوتے ہیں کہ کوئی یورپین سارا ان سے بڑھ کر شاید ہی بنا سکے۔ (ج ۲ - ص ۲۷۰ - ص ۲۷۴)

کاریگروں کی حالت برٹن نے کاریگروں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے کئی اہم اور دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ اس کی قدر جیسی ہونی چاہئے ویسی نہیں ہوتی۔ یہاں کی صنعت و حرفت کا سارا انحصار بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی پر ہے۔ عام طور پر دہلی میں نہ کاریگروں کے کارخانے ہیں نہ اُن کو عوام سرپرستی حاصل ہے، لکھتا ہے: ”اگر کاریگروں اور کارخانہ داروں کو کچھ ہمت دلائی جائے تو بے شک مفید اور عمدہ صنعتوں کو ترقی

ہو سکتی ہے“ (ج ۲ - ص ۲۷۱ - ص ۲۷۵)

ملک کے بہترین کاریگر دربار سے وابستہ ہو جاتے ہیں، جو باقی رہ جاتے ہیں اُن کی حالت بڑی کس مہر سی کی ہوتی ہے۔ ان کی واجبی اُجرت بھی نہیں ملتی۔ جب کسی امیر یا منصب دار کو کسی کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کو بازار سے بلا لیتا ہے اور جبراً کام لیتا ہے اور جو مزدوری جی چاہتا ہے دے کر ٹال دیتا ہے۔ کوئی کاریگر اصرار کرتا ہے تو اس پر سختی کی جاتی ہے۔

زیور کا استعمال اس قدر عام ہے کہ فوجی چاہے خود بھوکا مرنے کو لیکن اپنی بیوی اور بچوں کو زیور ضرور پہنائے گا۔ (ج ۱ - ص ۴۰۲ - ص ۴۲۴)۔ زیورات مثلاً کڑوں، توڑوں، بالیوں، نتھوں، انگوٹھیوں کے بار بار بننے میں کافی سونا چھینچ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کافی مقدار زر دوزی، کارچوبی کام کے کپڑوں، پگڑیوں کے طروں، پٹکوں وغیرہ کے بنانے میں خرچ ہو جاتی ہے۔

(ج ۱ - ص ۴۰۲ - ص ۴۲۴)

تعلیمی حالات برٹن نے کہیں کہیں ہندوستان کے تعلیمی حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے بنارس کے متعلق اپنے تاثرات خاص طور پر بیان کئے ہیں۔ لکھتا ہے کہ بنارس کو ہندوؤں کا دارالعلم خیال کرنا چاہئے ہندوستان

میں اُس کا مرتبہ وہی ہے جو قدیم یونان میں ایتھنز کا تھا۔ (ج ۲ - ص ۲۲۲ - ص ۳۳۴)۔ یہاں دور دور سے برہمن اور پنڈت آتے ہیں اور برسوں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ طرز تعلیم قدیم مکتبوں کا ہے، باقاعدہ جماعتیں نہیں ہوتیں۔ پنڈت اپنے گھروں پر یا شہر کے باہر باغوں میں رہتے ہیں۔ ۴ سے لیکر ۱۵ شاگرد تک ایک پنڈت کے پاس رہتے ہیں۔ عموماً ایک پنڈت ۶ یا ۷ سے زیادہ شاگرد اپنی

نگرانی میں نہیں لیتا۔ کوئی بہت ہی بڑا فاضل ہو تو ۱۵ شاگردوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمہ لیتا ہے۔ یہ شاگرد دس دس بارہ بارہ سال اپنے استادوں کے پاس رہتے اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایام طالب علمی میں اُن کو صرف کچھ دسی کھانے کے لئے ملتی ہے۔ اس

کچھ پڑی پر جو صرف ہوتا ہے وہ دو لٹمنڈ سا ہو کار ادا کرتے ہیں۔ یہ ہندو طالب علم پہلے منسکرت زبان سیکھتے ہیں پھر پڑائی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد بعض طالب علم، علم فلسفہ حاصل کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لکھتا ہے کہ ہندوستانیوں کی طبیعت میں سستی اور کاہلی ہوتی ہے۔ اس لئے فلسفہ میں بہت کم ترقی کرتے ہیں۔ (ج ۲ - ص ۲۲۲ - ۲۲۳ - ص ۳۳۴ - ۳۳۶)۔ علم طب پر ہندوؤں کے پاس بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں لیکن ان کی ترتیب ناقص ہے۔ ان کو صرف نسخوں کا مجموعہ سمجھنا چاہئے۔ (ج ۲ - ص ۲۳۱ - ۲۳۸)۔ علم ہیئت میں ہندوؤں کو خاصی مہارت ہے اور اپنے پتروں کی رو سے گرہن وغیرہ کے حساب صحیح بتا دیتے ہیں۔ (ج ۲ - ص ۲۳۴ - ۲۳۹)۔ علم جغرافیہ سے ہندو ناواقف ہیں۔ دنیا کو چھٹی اور مثلث شکل کی بتاتے ہیں کہ اس میں سات ولایتیں ہیں اور ہر ولایت اپنے خاص سمندر سے گھری ہوئی ہے۔

بنارس میں سنسکرت کی کتابوں کا خاصہ ذخیرہ ہے۔ ایک بہت بڑا کمرہ ان سے بھرا ہوا ہے۔ ویڈوں کے نسخے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ لکھتا ہے کہ دانش مند خاں کو وید حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن بڑی تلاش کے باوجود بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ (ج ۲ - ص ۲۲۵ - ۳۳۶)

اورنگ زیب کا بلند نظر تعلیم مسلمانوں کے نصاب تعلیم کے متعلق اورنگ زیب کی رائے برتنے نے بڑی تفصیل سے نقل اونچے طبقہ میں پیدا ہو چلا تھا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد اس کے استاد ملا محمد صالح دربار میں حاضر ہوئے۔ امید تھی کہ اب اگر انقدر انعام ملیں گے اور مراتب میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اورنگ زیب نے تین ماہ تک ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پھر ایک دن خلوت میں طلب کیا، جہاں برتنے کا آقا دانش مند خاں بھی موجود تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے استاد سے جو گفتگو کی تھی وہ برتنے کو اپنے آقا ہی سے معلوم ہوئی۔ اورنگ زیب صلاحی کے طریقہ تعلیم، معلومات نصاب - ہر چیز پر تنقید کی اور کہا کہ آپ کی جغرافیہ دانی اور تاریخ کی معلومات کا یہ حال ہے کہ آپ نے مجھے پڑھایا کہ یورپ ایک چھوٹے سے جزیرہ ہے زیادہ نہیں ہے اور فرانس اور انڈس کے بادشاہ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی طرح ہیں۔

”کیا مجھ جیسے شخص کے استاد کو لازم تھا کہ دنیا کی ہر ایک قوم کے حالات سے مطلع کرتا۔ مثلاً ان کی جنگی قوت سے، ان کے وسایل آمدنی اور طرز جنگ سے، ان کے رسم و رواج، مذاہب اور طرز حکمرانی سے اور خاص امور سے جن کو وہ اپنے حق میں زیادہ مفید سمجھتے ہیں، تفصیل کے ساتھ علحدہ علحدہ مجھ کو بتاتا! اور علم تاریخ مجھے ایسا سلسلہ دار پڑھاتا کہ میں ہر ایک سلطنت کی جڑ بنیاد اور اسباب ترقی و تنزل اور ان حادثات و واقعات اور غلطیوں سے واقف ہو جاتا جن کے باعث ان میں بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں۔“ (ج ۱ - ص ۲۴۸ - ۲۴۹)

اورنگ زیب نے پھر یہ اعتراض کیا کہ اس کا زیادہ وقت عربی زبان، اس کی صرف و نحو سکھانے میں ضایع کر دیا گیا۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ ہمسایہ قوموں کی زبانیں سکھائی جاتیں۔ (ج ۱ - ص ۲۴۸ - ۲۴۹)

ملا صالح سے گفتگو کی یہ تفصیل تو دانش مند خاں نے برتنے کو بتائی تھی۔ بعد کو بعض اور لوگوں سے اس نے پینا کہ اورنگ زیب نے اپنی گفتگو میں کئی اور اہم باتیں بھی کہی تھیں۔ مثلاً یہ کہ کیا نادر صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ ادا ہو سکتی ہے اور ہماری اصلی زبان میں اسی طرح نہیں ہو سکتی؟ آپ نے جو فلسفہ پڑھایا تھا اور جس طرح پڑھایا تھا، اس سے ذہن کی تربیت کی امید نہیں ہو سکتی۔ ایسا فلسفہ پڑھانا چاہئے جس سے ذہن اس قابل ہو جائے کہ بغیر دلیل صحیح کسی چیز کو تسلیم نہ کرے، اس میں ضبط اور قابو پیدا ہو جائے کہ ترقی اور تنزل دونوں حالتوں میں اپنے آپ پر قابو رکھ سکے۔

اورنگ زیب کی یہ تنقید صرف ملا صالح کے طرز تعلیم پر نہ تھی، بلکہ یہ اس نصاب تعلیم کے خلاف آواز تھی جو سترویں صدی میں

راج تھا اور جس کی افادیت مشتبہ ہو چکی تھی !

ہندوستانی طریقہ علاج برتنے طبیب تھا اور اسی حیثیت سے دانش مند خاں کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس نے ہندوستان کے طریقہ علاج کے متعلق بعض بے حد دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ لکھتا ہے کہ ہندوؤں کا خیال ہے کہ بخار میں فادہ سب سے بڑا علاج ہے۔ وہ اس مرض میں شوربہ یا بخنی سے زیادہ مفرکسی چیز کو نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں بخار والے کے معدہ میں فوراً خراب ہو جاتی ہیں۔ ہندو اطباء عام طور پر فصد لینے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مسلمان طبیب بھی بعض معاملات ہندوؤں کے طرز پر کرتے ہیں۔ بخار میں شوربہ اور بخنی سے پرہیز کرتے ہیں۔ فصد کے معاملہ میں ان کا نظریہ ہندوؤں سے مختلف ہے وہ فصد بہت کھلاتے ہیں۔ اور خون کافی مقدار میں نکلوا دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو اٹھارہ یا بیس اونس خون تک فصد کے ذریعہ نکلوا دیتے ہیں۔ (ج ۲۔ ص ۲۳۲، ص ۳۳۸-۳۳۹)

ہندو مذہب کے متعلق برتنے کی تحقیق برتنے نے ہندوستان میں قیام کے دوران میں ہندو مذہب کے بنیادی عقاید کے متعلق بھی تحقیق کی تھی۔ اس تحقیق میں اس کو دانش مند خاں کے علمی ذوق سے بڑی مدد مل گئی تھی۔ اس نے ہندو مذہب کے متعلق ایک علاحدہ رسالہ میں لکھا تھا جس میں ہندوؤں کے مندروں کی تصویریں جمع کی تھیں۔ (ج ۲۔ ص ۲۱۶، ص ۳۳۲)۔ ہندوستان چھوڑنے سے کچھ عرصہ قبل وہ بنارس گیا جہاں ایک بہت بڑے پنڈت سے ملا اور اس کا کتب خانہ دیکھا۔ اس پنڈت نے چھ اور پنڈتوں کو بھی بلا لیا۔ برتنے نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور بت پرستی کے متعلق ہندو مذہب کا بنیادی نقطہ نظر معلوم کرنے کی کوشش کی۔

جس وقت برتنے ہندوستان آیا تھا، ہندوستان میں بعض مسلمان مفکر اور ہندو فاضل، وحدت وجود کے مسئلہ پر غور و فکر کر رہے۔ ملا شاہ، دلا شکوہ، سرمد وغیرہ اس نظریہ کے پرچمیں مبلغ تھے۔ ادھر شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد المظاہر کے مکتب خیال کے لوگ اس کی مخالفت پر مکر بستہ تھے۔ برتنے لکھتا ہے:-

”تھوڑی سی عرصہ گزرا کہ اس مسئلہ کی بابت ہندوستان میں بڑا شور و غل تھا“

ناگافقیروں کے متعلق برتنے کے تاثرات برتنے کو ہندو اور مسلمان فقیروں سے ملاقات کے بہت موقع ملے۔ اپنے سفر نامہ میں اس نے کئی جگہ ان فقیروں کی زندگی اور ان سے توہمات اور نیام کے عقاید کا ذکر کیا ہے۔ جوگیوں کے متعلق لکھتا ہے:-

”جوگیوں کا جسم، لمبے لمبے بال، دہلی اور پٹنہ کی باہر اور ہل کھائے ہوئے ناخن اور وہ ڈراونی وضع میں۔ بیان کیا ہے، اس عالم سفلی میں اس سے زیادہ مقبول شکل خیال میں نہیں آسکتی۔“

(ج ۲۔ ص ۱۹۲-۱۹۳، ص ۳۱۴)

برتنے نے جب نرد کو دہلی کے بازار کوچوں میں غمگنا پھرتے ہوئے دیکھا تو اس کو بڑی نفرت پیدا ہوئی (ج ۲۔ ص ۱۹۳، ص ۳۱۴) لکھتا ہے: یہاں ناگافقیروں کی ٹولیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔

برتنے نے بہت سے فقیروں کو غیر طبعی طریقوں پر ریاضت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لکھتا ہے:-

”ان میں سے بہت سی صورتیں تو اس قدر سخت اور مشکل ہیں کہ ہمارے ملک کے نٹ بھی ان کی تقلید نہیں کر سکتے۔“

(ج ۲۔ ص ۱۹۵-۱۹۶، ص ۳۱۴)

ستی کے متعلق برتنے کے خیالات

ستی کی رسم کے متعلق برتنے نے سیاحوں سے بہت کچھ سنا تھا۔ ہندوستان آکر اس مسئلہ کی بھی پوری طرح تحقیق کی۔ لکھتا ہے کہ سیاحوں کے بیانات میں بڑا شک و شبہ ہے۔ پہلے کی نسبت ستی کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ کیونکہ مسلمان بادشاہ اس رسم کے نیست و نابود کرنے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ لیکن اس کے انسداد کے لئے انھوں نے کوئی قانون نہیں بنایا۔

”کیونکہ ان کی پالیسی کا یہ ایک جزو ہے کہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کی مذہبی رسوم کے بجالانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں“

(دج ۲ - ص ۱۷۲ - ۱۷۳ - ص ۳۰۶)

چنانچہ مسلمان بادشاہوں نے کوئی صاف قانون اس سلسلہ میں نافذ کرنے کے بجائے یہ حکم دے دیا ہے کہ کوئی عورت اپنے صوبے کے حاکم کی اجازت کے بغیر ستی نہیں ہو سکتی۔ حاکم سے جب اجازت مانگی جاتی ہے تو وہ خود سمجھاتا ہے اور عورت کو اپنی مجلس میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات اس کو سمجھائیں۔ اس تمام کوشش کے باوجود ستی ہونے والی عورتوں کی تعداد کافی ہوتی ہے۔ برتنے نے ستی کے متعلق گفتگو کی تو اس کو اندازہ ہوا کہ ستی ہونا محبت کے سبب سے نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک خاص طور کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔

برتنے نے اپنے مشاہدات اس سلسلہ میں تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس کا ایک دوست، ہندی داس تپ دق میں مبتلا ہوا۔ خود برتنے نے دو سال تک اس کا علاج کیا لیکن سود مند نہ ہوا۔ جب وہ مر گیا تو اس کی بیوہ نے ستی ہونے کا ارادہ کیا اور برتنے نے دانش مند خاں کی مدد سے اس عورت کو ستی ہونے سے باز رکھا۔ (دج ۲ - ص ۱۷۵ - ص ۳۰۷) لیکن جب برتنے احمد آباد سے راجستھان ہو کر آکرہ کو جا رہا تھا تو ایک قصبہ میں اس نے ایک عورت کو ستی ہوئے دیکھا بھی اور اس سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ (فکھ نظر)

ادارہ فروغ اردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور اس کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں، آپ کو صرف یہ کہنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت ہمیں بھیج دیجئے۔ پندرہ دن کے اندر آپ کو ذریعہ ریشٹری مل جائیں گی (دی پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جاسکتیں) آرڈر دنش روپیہ سے کم کا رہے اور محصول ڈاک بحساب پندرہ فی صدی روانہ کیا جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

سیاست الہیہ - ع	امراؤ جان ادا - لل	جوڑ توڑ - لل	سسرال - ع	اردو غزل گوئی - ع	مکاتیب خیر - ع
ہماری داستانیں - ع	خدا خواستہ - ع	مضامین شوکت - ع	کارٹون - ع	عرب کے تین مدبر تے - ع	طنز و مزاح نمبر ع
مضامین جمال الغانی - ع	کتیا - ع	غزالہ - ع	قاضی جی - ع	خالد بن ولید - لل	پطرس نمبر - ع
انتقاد - ع	بقراط - ع	سودیشی ریل - ع	دیگرہ وغیرہ - ع	منٹو نمبر مجلد - ع	شخصیات نمبر مجلد - ع

سرد و منصور کی حریت

فارسی کی پہلی شاعرہ ”رابعہ“

(فرمان فچوری)

جو لوگ فارسی کا ذوق نہیں رکھتے وہ شاید رابعہ کے نام سے بھی واقف نہ ہوں لیکن فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں نے بھی فارسی کی اس قدیم و عظیم شاعرہ کو منظر عام پر لانے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کی۔ حالانکہ رابعہ فارسی کے قدیم ترین شعراء رودکی - شہید بلخی - دقیقی اور ابوشکور وغیرہ کی ہم عصر ہے اور اس کا تعلق خاندان سامانیہ کے اس ممتاز دور سے ہے جو فارسی شعر و ادب کا اولین دور کہا جاتا ہے۔ سامانیہ دور طاہریہ اور صفاریہ کے خاتمہ پر ۳۹۵ھ سے شروع ہوتا ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے علماء و فضلا و شعراء پیدا ہوئے بلکہ یہ بھی ہوا کہ ایرانی ادب اپنے قومی و ملکی مزاج سے پہلی بار ہم آہنگ ہوا۔ رابعہ اسی عہد سے متعلق ہے اور اس کی ادبی و فنی شخصیت فارسی ادب کے اس ابتدائی دور سے ایسی مستحکم ہو چکی تھی کہ قدیم تذکرہ نگار جو کہ اس وقت عبور توں کا ذکر تو درکنار ان کا ہر سر عام ناہم لینا بھی گناہ سمجھتے تھے رابعہ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ چنانچہ فارسی علم بیان و توانی و عروض کی قدیم ترین کتاب المعجم از شمس قیس بن رازی اور فارسی شعراء کے قدیم ترین مستند تذکرہ لباب الالباب مصنفہ عوفی میں رابعہ کا ذکر آیا ہے اور اس کے کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ لیکن یہ ذکر مختصر ہے اور اس سے رابعہ کے عام حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ صاحب لباب الالباب کا بیان ہے کہ:-

”رابعہ اگرچہ زن بود اما بفضل بر دان جہاں بجزیدے فارس ہر دو میدان و دالی ہر دو بیان۔“

بر نظم تازی قادر و در شعر پارسی لغایت ماہر و باغایت ذکائے خاطر و جدت طبع پیوستہ۔ عشق باختر و شاہد

بازاری کردے۔“ (لباب الالباب - صفحہ ۲۹۴ - چھاپ طہران - مرتبہ سعید نفیسی)

مولانا شبلی نے بھی شعر المعجم میں رابعہ کے ذکر کو غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔ انھوں نے دور سامانیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رابعہ کے متعلق صرف اس قدر وضاحت فرمائی ہے:-

”اس دور کی خصوصیت یادگار ہے کہ شعر و شاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا۔ رابعہ قر واری بلخی جو

رودکی کی ہم عصر تھی اعلیٰ درجہ کی شاعر تھی، اس کا باپ کعب اعراب میں سے تھا، لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی

اور اس وجہ سے عربی، فارسی دونوں میں شعر کہتی تھی۔ نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی، یکتا نش

نام ایک غلام سے اس کو عشق تھا، لیکن پھر مجازی سے گزر کر عشق حقیقی تک فوجت ہو چکی۔ چنانچہ اس کا

شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے، تاہم چونکہ عورت کا اجنبی مرد سے محبت کرنا اسلامی جماعت میں معیوب تھا

اس لئے لوگوں نے اسے قتل کر ڈالا۔“

(شعر المعجم از شبلی صفحہ ۲۶ - مطبع ملا معارف اعظم گڑھ)

شہلی کا یہ بیان لبالب الالباب سے نہیں بلکہ مجمع الفصحا سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ شہلی نے رابعہ کے قاتل کا سراغ نہیں دیا، صاحب مجمع الفصحا کے بیان کے مطابق رابعہ کو خود اس کے حقیقی بھائی نے بر بنائے بدگمانی قتل کیا۔ مجمع الفصحا کی اصل عبارت یہ ہے :-

”پدرش کعب در اصل از اعراب بود و در پنج و قزوار و لیست و در حوالی قندھار و سیستان و حوالی بلخ کامرا بنہا نمودہ۔ کعب پسے حارث و اشہ و دخترے رابعہ نام کہ اور ازین العرب نیز گفتند۔ رابعہ مذکورہ در حسن و جمال و فضل و کمال و معرفت و حال و چیدہ روزگار و فریدہ دہر و ادوار صاحب عشق حقیقی و مجازی۔ فارس میدان ادبیات فارسی بود۔ اور اسیلے بکتاش نام غلامے از غلامان برادر خود بہر رسیدہ و انجا مشہور عشق حقیقی و بدگمانی برادر او کشتہ۔“ (مجمع الفصحا جلد اول صفحہ ۲۲۲)

صاحب مجمع الفصحا نے رابعہ کے اشعار بھی نقل کئے ہیں اور اپنی ثنوی گلستان ارم کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے رابعہ اور بکتاش کی داستان غم نظم کی ہے، فارسی کے مشہور شاعر شیخ فرید الدین عطار کی ثنوی ”الہی نامہ“ کا موضوع بھی رابعہ اور بکتاش کا عشق قصیدہ ہے۔ عطار نے پانچ سو اشعار کی طویل ثنوی میں رابعہ کی دردناک داستان محبت از آغاز تا انجام بڑے فنکارانہ انداز سے نظم کی ہے۔ رابعہ کی داستان کا انداز اگرچہ مجازی معلوم ہوتا ہے، لیکن قدیم علماء و فضلاء نے رابعہ کے عشق کو بالعموم حقیقت پر محمول کیا ہے۔ رابعہ کی پاکبازی اور عشق حقیقی کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں رابعہ کو ان صوفیائے خدا رسیدہ میں شمار کیا ہے جو شراب عرفان و حقیقت سے سرشار ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صفائی اپنی تاریخ ادبیات ایران میں مشہور صوفی بزرگ ابو سعید ابوالخیر کا یہ قول رابعہ کے متعلق نقل کیا ہے :-

”دختر کعب عاشق بود بر غلامے اما عشق او از قبیل عشق باغے مجازی نہ بود۔“

ان مختصر حالات سے رابعہ کی شخصیت کی دلکشی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کون ہے جس کے دل میں اس حسین و جمیل صوفیہ فارسی عربی کی نامور شاعرہ اور معشوق عاشق نامظلومہ کے حالات جاننے کا شوق نہ ہو گا اور کون ہے جو فارسی شاعری کی پہلی ملکہ کی غم بھری داستان حسن و عشق سننے کے لئے بے تاب نہ ہو گا لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی تفصیلی زندگی تاہنوز ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ قدیم تذکروں میں مختصر ذکر ملتا ہے۔ دور حاضر کے مورخین نے بھی اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ڈاکٹر شفق نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس مشہور شاعرہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ رابعہ کی داستان پر آقائے عبد الرحمن قراقرزی نے ”داستان دوستان“ کے نام سے اور آقائے رضائے ایزدی صمدانی نے ”رابعہ شاعرہ عصر سامانیہ“ کے نام سے تفصیلی و تحقیقی مقالے تحریر کئے ہیں جن کا خلاصہ ”زمانہ بخور“ کے مولف علی اکبر سلیمی نے دید کہ بابے اور سچ پوچھو تو اس آخر الذکر کتاب میں رابعہ کے متعلق مختلف جگہوں سے چند ایسی باتیں جمع کر دی ہیں جس کی مدد سے رابعہ کی زندگی کی تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

رابعہ جس کا تعلق چوتھی صدی ہجری سے ہے، قزوین میں پیدا ہوئی، قزوین کا علاقہ اب سے کوئی ایک ہزار سال پہلے افغانستان و پنجاب کے درمیان واقع تھا۔ اس میں ایک قبیلہ آباد تھا جس کے سردار کا نام کعب تھا۔ کعب کے حارث نامی ایک بیٹا اور رابعہ نام کی ایک لڑکی تھی جن سے کعب غیر معمولی محبت کرتا تھا۔ کعب کے انتقال کے بعد حارث سلطنت و جاہداد کا وارث ہوا اور اپنی جانشینی کے سلسلہ میں ایک جشن کیا اور تمام رات رقص و سرود میں گزاری۔ اس جشن میں عام و خاص، آقا و غلام بھی شریک تھے۔ حارث کے غلاموں میں ایک غلام بکتاش نامی تھا۔ بکتاش کی چڑھتی جوانی۔ بھگی مسیں۔ نشیلی آنکھیں، کشادہ پیشانی اور گھونگر والے بالوں نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دئے تھے، چنانچہ اس شب میں اس غلام نے گھر کی ملکہ رابعہ کو اپنا غلام کر لیا۔ رابعہ

نے رات بڑی بے چینی میں بسر کی اور صبح ہوتے ہی دایہ کے ذریعہ بکناش کو پیغام محبت بھجوایا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ پہلے ہی رابعہ کے دام محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ یہ سن کر رابعہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ دونوں بہت جلد یک جاں دو قالب ہو گئے۔ رابعہ، بکناش کا نظارہ کرتی رہتی اور اپنے کہے ہوئے ترانے لگاتار رہتی۔ ایک دن بکناش بے تابانہ حادث کے محل سرا میں داخل ہوا اور رابعہ کے دامن پر سر رکھ کر آنسوؤں کے موتی نثار کرنے لگا۔ رابعہ نے اسے اپنے آغوش میں لے لیا اور غیب سے ایک آواز آئی کہ اے بکناش تو محبت میں اپنے آپ کو اس طرح جلا کر خاک کر کہ حقیقت سے قریب تر ہو جائے۔ حادث کو رابعہ اور غلام کے ان گہرے روابط کی خبر نہ تھی لیکن کچھ دنوں بعد حادث کو اس کا پتہ چل گیا، جس سے وہ بہت ہدگمان ہوا۔ ہر چند کہ باپ نے مرتے وقت رابعہ کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی نصیحت کی تھی لیکن حادث اسے فراموش کر کے بکناش کے درپے آزار ہو گیا۔ حتیٰ کہ ایک روز وہ دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنے غلام بکناش کو بھی ساتھ لے گیا۔ بکناش بری طرح زخمی ہوا اور بظاہر اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ لیکن بکناش کی عاشق رابعہ نے اس کی جان بچائی اور کسی طرح دشمنوں کے نوغے سے نکال کر اسے گھر لائی۔ حادث کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی اور رابعہ سے ہمیشہ کے لئے دل گرفتہ ہو گیا۔ ادھر رابعہ کی مفید حرام ہوئی اور وہ غم سے نڈھال ہونے لگی آخر کار اس نے اپنے دل کا چور اپنے بھائی پر صاف طور پر ظاہر کر دیا۔ لیکن ابھی غیر دل کو اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ ایک روز رود کی کی نظر اتفاق سے رابعہ پر پڑی رابعہ سے اس نے ترانہ سنا اور بھانپ گیا کہ رابعہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے چند دن گزر گئے ایک دن امیر نصر شہر یار کے دربار میں علماء و فضلا جمع تھے امیر نے اشعار سنانے کی فرمائش کی، رود کی نے چند ترانے سنائے جن کے آخر میں رابعہ کا نام بطور تخلص آیا تھا امیر اشعار سن کر بھرپور آٹھا اور رابعہ سے ملاقات کرنے کا مشتاق ہوا رود کی نے جواب دیا کہ وہ ایک شاہد بازاری ہے اور ایک غلام پر عاشق ہے۔ حادث خود بھی اس مجمع میں موجود تھا اسے رود کی کا یہ طنز بڑا ناگوار گذرا وہ دوڑا ہوا گھر آیا اور بکناش کو ایک کنوئیں میں قید کر کے رابعہ کو ایک گرم حمام میں ڈال دیا۔ رابعہ اپنے خون سے حمام کے در و دیوار پر ترانے لکھتی رہی۔ جب بکناش کو رابعہ کی تکلیف کی خبر پہنچی۔ تو وہ قید سے قرار ہو کر حمام پہنچا۔ لیکن اسے پہونچنے میں کافی دیر ہو چکی تھی اور اس کی محبوبہ اسلٹا میں اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی، بکناش اس خبر جانکاہ سے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ حادث کو قتل کر کے مجبورہ کے خون کا بلالیا اور اس کے بعد خود بھی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

یہ ہے رابعہ کی داستان عشق جو ایک المیہ ہے اور جسے سن کر ہم رابعہ کے استقلال، ہمت، ایثار، اور حقیقی جذبہ محبت کے ظہر ہو جاتے ہیں۔ مولانا جامی اور مولانا ابوسعید خیر نے اسی لئے رابعہ کو صوفیوں کے گرد و میں شامل کیا ہے۔ رابعہ نے جس ختمہ پیشانی سے طلب حقیقت میں اپنی جان قربان کی ہے۔ اس کی مثال سرمہ اور منصور کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ لیکن رابعہ صرف ایک صوفی منش پر گزیرہ عورت ہی نہ تھی بلکہ اپنے وقت کی ایک ایسی عالم و فاضل شاعرہ بھی جس کی مثالیں تاریخ میں خال خال ملتی ہیں۔ رابعہ کے معاصر شعرا اور قدیم مذکورہ نگاروں نے اس کے علم و فضل اور فصاحت و بلاغت اور زبان دانی کا ہر جگہ ذکر کیا ہے۔ رابعہ نے یہ اعلیٰ تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی۔ اس کا سراغ نہیں ملتا کسی کتاب میں رابعہ کے کسی استاد کا ذکر بھی نہیں آیا جس سے اس کے ذرائع تعلیم کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکے، رابعہ کا خاندان بھی کچھ ایسے بڑے حکمرانوں کا تھا کہ اس کا ذکر کوئی مورخ اپنا فرض خیال کرتا۔ اس وقت مشرق میں تاریخ نگاری کا فن صرف حاکم اعلیٰ اور اس کے متعلقین و وفاقین کے ذکر تک محدود تھا۔ عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکلنے کی اجازت نہ تھی، اسے سماجی زندگی میں کوئی باوقار مقام بھی حاصل نہ تھا۔ کسی عورت پر نظر ڈالنا یا برسر عام اس کا نام لینا سخت کناہ تھا۔ رابعہ اس ماحول کی پروردہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں رابعہ کے حالات زندگی کسی کتاب میں کیونکر آسکتے تھے۔ وہ چونکہ ایک متمول گھرانے کی پردہ نشین خاتون تھی اس لئے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے قدیم روضا اور امرا کے خاندانوں کی طرح گھر ہی میں اعلیٰ تعلیم پائی ہوگی اور اسے شعر و ادب کا

ذوق خود اپنے گھر کی فضا اور باپ کی تربیت سے ملا ہوگا۔ تمام علمائے ادب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رابعہ فارسی ادب کی پہلی قابل ذکر شاعرہ ہے یہی نہیں بلکہ وہ فارسی ادب کے معماروں اور موسموں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ اس نے اسوقت فارسی میں شعر گوئی شروع کی جب فارسی اپنے مقامی رنگ میں پہلے پہل ایران کی سرزمین میں قدم جا رہی تھی۔ صاحب لباب لایا ہے رابعہ کے کلام کو شیرینی و فصاحت سے ملبو بتایا ہے، اس کے کلام میں تکلف و تصنع یا رسمی باتوں کا ذکر نہیں بلکہ آپ بیتی کی جھلک ہے اسی لئے اس میں حسن و اثر اور زور تینوں چیزیں موجود ہیں۔ ہم یہاں چند اشعار بطور نمونہ نقل کئے جا رہے ہیں ان سے رابعہ کی شعرا شخصیت کے متعلق رائے قائم کرنے میں براہ راست مدد ملے گی۔

نعمیم بے توہ خواہم حجیم با تو رواست کہ بے تو شکر زہر است با تو زہر عسل
الائے باد شب گیری پیام من بہ دلبر بر بلوآں ماہ خوبا نرا کہ جان بادل برابر بر
دوش بر شاخک درخت آں مرغ توجہ می گردد نمی گریست بزاری
من جدایم زیار آزاں می نالم توجہ نالی کہ با مساعده یاری
عشق او باز اند و اودم بہ بند کوشش بسیار نباید بود مستند
توسنی کردم نہ انستم ہی کز کشیدن سخت تر گردد کمند
زشت باید دید و انگارید خوب زہر باید خورد و پندارید قند
دعوت من بر تو اں شد کایزدت عاشق کناد بر یکے سنگیں دے تاہریاں چوں خولشین
تا بدانی درد و عشق و داغ و غم کشتی چوں بہر اندر بہ پیچی پس بدانی قدر من

رابعہ عربی کی بھی کامیاب شاعرہ تھی۔ اس کے فارسی کلام میں عربی الفاظ، ترکیبیں اور فقرے بکثرت استعمال ہوئے ہیں فارسی کے ایسے اشعار بھی تذکرہ میں ملتے ہیں جن میں ایک مصرعہ فارسی اور دو سرائیکی ہیں۔ ان امور سے رابعہ کی قدرت زبان و کلام کا اندازہ ہوتا ہے اور ہمیں ڈاکٹر صفا کی اس رائے کی تائید کرنی پڑتی ہے کہ ”سخن او در لطافت و استعمال بہر معانی دل انگیز و فصاحت و حسن تاثر معروف است“

رعایتی عملان

من ویزواں - مذہبی استفسارات و جوابات - نگارستان - جمالیستان - مکتوبات نیازتین حصے - مذہب -
حسن کی عیاریاں - فراست الید - مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم - قول فیصل - شہاب کی سرگزشت - نقاب ٹھکانیکے بعد
میزان = اللہ

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع حصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں۔
مینجر نگار لکھنؤ

چند گھنٹے قادیان میں

(نیا زنجیری)

۲۸، ۲۹ جولائی کی وہ چند ساعتیں جو میں نے قادیان میں بسر کیں، میری زندگی کی وہ گھڑیاں تھیں جن کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

حیات انسانی کا ہر لمحہ زندگی کا ایک نیا درس، ایک نیا تجربہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اگر زندگی نام صرف سانس کی آمد و شد کا نہیں بلکہ آئینہ کھول کر دیکھنے اور سمجھنے کا بھی ہے۔ اور ————— ان چند ساعتوں میں جو کچھ میں نے یہیں دیکھا وہ میری زندگی کا اتنا دلچسپ تجربہ تھا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ۵۰ سال پیچھے ہٹ کر وہی زندگی شروع کرتا جو قادیان کی احمدی جماعت میں مجھے نظر آئی۔ لیکن

حیث صد حیف کہ مادیہ خبردار شدیم
میں انفرادی حیثیت سے ہمیشہ بے عمل انسان رہا ہوں، لیکن مسائل حیات کو (جن میں مذہب بھی شامل ہے) میں ہمیشہ اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں اور یہ نقطہ نظر میرے ذہن میں حرکت و عمل کے سوا کچھ نہیں۔ پھر یہ داستان بہت طویل ہے کہ کچھ نصابی نصف صدی میں کتنی خانقاہیں، کتنے خانوادے، کتنے ادارے، کتنی درسگاہیں اور کتنے جلوہ ہائے منہر و محراب میری نگاہ سے گزرے، اور میں کس طرح ان سے بے نیازانہ گزر گیا۔ لیکن اب زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ احمدی جماعت کی حقیقی جاگتی تنظیم عمل دیکھ کر میں ایک جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی زندگی کے اس نئے تجربہ و احساس کو کون الفاظ میں ظاہر کروں۔

میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور علماء اسلام کی بے عملی کی طرف سے اس قدر راجس ہو چکا ہوں کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں کبھی آثار حیات پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن اب احمدی جماعت کی حقیقی جاگتی تنظیم عمل کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خول کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

کیونکہ عالم اسلامی میں آج یہی ایک ادارہ ایسا ہے جو

دعوت برے گئے دنوائے گم شد

اور اسلام کا مفہوم میرے ذہن میں "دعوت برگ دنوا" کے سوا اور کچھ نہیں۔

لوگ منزل تک پہنچنے کے لئے راہیں ڈھونڈتے ہیں، برسوں سرگرداں رہتے ہیں اور ان میں صرف چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو منزل کو پالیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں میں سے ایک میرزا غلام احمد قادیانی بھی تھے۔ سواب یہ فکر جستجو کہ وہ کن راہوں سے گزر کر منزل تک پہنچے۔ بالکل بے سود ہے، اصل چیز راہ پیائی نہیں بلکہ منزل تک پہنچ جانا ہے اور اگر میں احمدی جماعت کو

پسند کرتا ہوں تو صرف اسی لئے کہ اس نے اپنی منزل پائی ہے اور یہ منزل وہی ہے جس کی بانی اسلام نے نشانہ ہی کی تھی۔ اس سے ہٹ کر میں اور کچھ نہیں سوچتا اور نہ سوچنے کی ضرورت۔

میرا قادیان آنا بھی اسی سلسلہ کی چیز تھی، یعنی جس جماعت کی عملی زندگی کا ذکر میں سنتا چلا آ رہا تھا اسے آنکھوں سے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

ہر چند میں بہت کم وقت لیکر یہاں آیا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نتیجہ تک پہنچنے کے لئے یہ قلیل فرصت بھی کم نہ تھی۔ کیونکہ اس جماعت کی زندگی ایک ایسا کھلا ہوا صحیفہ حیات ہے جس کے مطالعہ کے لئے نہ زیادہ وقت کی ضرورت ہے نہ کسی چون و چرا کی۔ اسی طرح ان کی دفتری تنظیم بھی گویا ایک شفاف آئینہ ہے جس میں رنگ کا نام تک نہیں۔ یکسر خلوص و اخلاق۔ یکسر حرکت و عمل۔

قادیان میں احمدی جماعت کے افراد جو ”درویشان قادیان“ کہلاتے ہیں، دوسو سے زیادہ نہیں جو قصبہ کے ایک گوشہ میں نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں اور ان کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پر تو آں

ہر کجا می نگری، انجمن ساختہ اند

یہی وہ مختصر سی جماعت ہے جس نے شیعہ کے خونیں دور میں اپنے آپ کو ذبح و قتل کے لئے پیش کر دیا اور اپنے ہادی و مرشد کے مسقط الراس کو ایک لمحہ کے لئے چھوڑنا گوارا نہ کیا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا ؟

یہی وہ جماعت ہے جس نے محض اخلاق سے ہزاروں دشمنوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور ان سے بھی قادیان کو ”دارالامان“ تسلیم کرالیا۔ یہی وہ جماعت ہے جو ہندوستان کے تمام احمدی اداروں کا سررشتہ تنظیم اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے اور یہی وہ دور افتادہ مقام ہے جہاں سے تمام اکنات ہند میں اسلام و انسانیت کی عظیم خدمت انجام دی جا رہی ہے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف کچھ تین سال کے عرصہ میں انھوں نے تعلیم اسلامی، سیرت نبوی، ضرورت مذہب، خصوصیات قرآن وغیرہ متعدد مباحث پر ۳۴ کتابیں ہندی، اردو، انگریزی اور گورکھی زبان میں شائع کیں اور ان کی ۴۴۰۵۰۰ کاپیاں تقریباً مفت تقسیم کیں۔

اسی طرح تعلیمی و نظایف پر جن میں مسلم و غیر مسلم طلبہ دونوں برابر کے شریک ہیں شیعہ سے شیعہ میں اس جماعت نے ۳۱ ہزار روپیہ صرف کیا۔ خود قادیان میں ان کے تین مدرسے قائم ہیں دو مڈل اسکول لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اور تیسرا مولوی فاضل کے نصاب تک۔ ان کے علاوہ تیرہ مدرسے ان کے ہندوستان کے مختلف مقامات میں ہیں جن پر جماعت کا ہزاروں روپیہ صرف ہو رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بڑی خدمت جو صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ قادیان کا شفا خانہ ہے۔ اس میں شیعہ سے اس وقت تک ۳۴۶۳۰۰ مریضوں کا علاج کیا گیا جن میں ۳۰ فی صدی مسلمان اور ۷۰ فی صدی غیر مسلم تھے۔ یہ ہیں وہ چند خدمات جماعت احمدیہ قادیان کی جن سے متاثر ہو کر شیعہ سے لے کر اس وقت تک قریب قریب ڈیڑھ لاکھ آدمیوں نے یہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا کی۔

یہاں میں نے کالج اور دارالافتاء کی ان عظیم الشان عمارتوں کو بھی دیکھا جنہیں بانی شریک احمدیت نے بڑے اہتمام سے طیار کر رکھا تھا، تقسیم ہند کے بعد ان پر جاہل و متروک کی حیثیت سے حکومت نے قبضہ کر لیا تھا لیکن اب یہ عمارتیں جماعت احمدیہ

کے حق میں واگزار اشت کر دی گئی ہیں۔

جس وقت میں نے حضرت میرزا صاحب کے بیت الفکر، بیت الدعا، بیت الریاضت، مسجد نور، مسجد قصی، اور منارہ مسیح کو کو دیکھا تو ان کی وہ تمام خدمات سامنے آگئیں جو تحفظ اسلام کے سلسلہ میں ایک غیر منقطع جدوجہد کے ساتھ ہزاروں مصائب جھیل کر انھوں نے انجام دی تھیں اور جن کے فیوض اس وقت ابھی دنیا کے دور و دراز گوشوں میں جاری ہیں۔

جس وقت میں قادیان پہونچا، اتفاق سے ایک جرمن احمدی ولیم ناصر بھی یہاں مقیم تھے، یہ ایک درویش صفت انسان ہیں جو ہینوں سے احمدیہ جماعت کے مختلف مرکروں اور اداروں کے سیاحانہ مطالعہ میں مصروف ہیں، میں ان کو دیکھتا تھا اور حیرت کرتا تھا کہ جرمنی ایسے سرد ملک کا باشندہ ہندوستان کی شدید گرمی کو کس طرح خوشدلی سے برداشت کر رہا ہے، لیکن جب میں نے ان سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ ان کو شاید سفر کا احساس تک نہیں پہنچ رہا ہے:

عشق ہر جامی بردار بہ سامان می برد

میں نے ان سے پوچھا کہ انھوں نے عیسوی مذہب چھوڑ کر اسلام کیوں قبول کیا، تو اس کا سبب انھوں نے "اسلام کی بلند اخلاقی تعلیم" ظاہر کیا جس کا علم انھیں سب سے پہلے جرمنی کی جماعت احمدیہ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ یہ جماعت بلاد مغرب و افریقہ میں جس جوش و انہماک کے ساتھ خدمت اسلام میں مصروف ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم حد درجہ سلیقہ و اہتمام کے شایع کر رہے ہیں۔ چنانچہ انگریزی، جرمنی، ڈچ اور سواصلی زبان کے ترجمے خود میں نے بھی دیکھے اور ان کے اس عزم و ولہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

میں نے یہاں سے رخصت ہوتے وقت اس قطعہ زمین کو بھی دیکھا، جہاں حضرت میرزا قلام احمد صاحب آسودہ خواب ہیں اور ان کی وہ تمام مجاہدانہ زندگی سامنے آگئی، جس کی کوئی دوسری نظیر مجھے اس دور میں تو کہیں نظر آتی نہیں۔

کیست کز کوشش فرما د نشان باز و دہر
مگر آن نقش کہ از تیشہ بخارا ماند

تاریخ ویدی لٹریچر

نواب سید حکیم احمد

یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب آریہ قوم نے اول اول یہاں قدم رکھا اور ان کی تاریخی و مذہبی کتاب رگوید وجود میں آئی، چنانچہ فاضل مولف نے اپنی کتاب کو اسی عہد سے شروع کیا ہے اور ویدی لٹریچر سے متعلق تاریخی، مذہبی، اخلاقی و روایتی کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو آپ نے نہایت وضاحت و سلاست کے ساتھ پیش نہ کیا ہو۔

پسلسلہ تحقیق انھوں نے مستشرقین مغرب سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ کھجیوں کے ترجمہ میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اصل عبارت کا کوئی لفظ ترک نہ ہونے پائے۔ اس کتاب میں جو زبان اختیار کی ہے وہ بہت سلیس اور عام فہم ہے۔

یہ کتاب صرف ویدی ادب بلکہ اس سے پیدا ہونے والے دوسرے مذہبی و تاریخی لٹریچروں کے لحاظ سے بھی اتنی مکمل چیز ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی اور اردو زبان میں یقیناً سب سے پہلی کتاب ہے جو خالص موضوع پر اس قدر احتیاط و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہو۔

قیمت چار روپے -

منیجر نگار لکھنؤ

قصاید ذوق

(محمد انصار اللہ نظر)

یہ حقیقت اب مسلم ہو چکی ہے کہ ذوق کے کلام میں تصرفات ہوئے اور یہ تصرفات صرف ان کی غزلوں ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ یہ سلسلہ قصاید تک پہنچا، جسے کہ بعض مقامات پر مسلسل اشعار حذف ہو گئے ہیں اور کہیں نئے اشعار کا اضافہ بھی ہو گیا ہے، اکثر اشعار میں لفظوں کی تبدیلی کا بھی پتہ چلتا ہے جو پورے مضمون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں:-
رویت لون کی ایک غزل کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:-

”کسی دوست نے فرمائش کی کہ زمین مرقوم الذیل آج کل طرح ہوئی ہے آپ بھی غزل کہئے۔ آغاز شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق۔ غزل کہی اس کا جا بجا چرچا ہوا یہاں تک کہ اکبر شاہ جنت آرام گاہ ان دنوں بادشاہ تھے انھوں نے فرمائش فرمائی کہ میاں ابراہیم سے کہو کہ ہمیں خود آکر وہ غزل سنائیں، یہ دلی عہد یعنی مرزا ابوالظفر کے ملازم خدمت تھے لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے ایک قصیدہ ان کی مدح میں کہہ کر شامل کر دیا۔“

غزل مذکور تمام و کمال گلشن بے غار (۱۲۵۹ھ) میں نقل ہے لیکن اس تذکرہ کے پہلے ادیشن میں جو ۱۲۵۵ھ میں شائع ہوا تھا یہ غزل درج نہیں ہے، ممکن ہے یہ غزل ۱۲۵۴ھ اور ۱۲۵۹ھ کے درمیان کی تصنیف ہو جبکہ بہادر شاہ ثانی سربراہی سلطنت تھے اور ان کے والد اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ گلشن بیخار کے علاوہ دوسرے قدیم تذکروں اور دیوان ذوق کے قدیم ادیشنوں میں

۱۔ دیوان ذوق مولفہ مولانا محمد حسین آزاد مطبوعہ علمی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۳۳ء ص: ۱۳۳
۲۔ مفتی نظام اللہ شہابی نے غزل زیر بحث کے مندرجہ ذیل شعر کے متعلق ایک لطیفہ بیان کیا ہے کہ اس کا مصرعہ اولیٰ خود بہادر شاہ ظفر نے نواب زینت محل بیگم کو چھپیر کھٹ پر سوتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا اور استاد ذوق نے اس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگا کر شعر پورا کر دیا تھا۔
دیکھنا آبی دوپٹہ منہ پر اس کے دقت خواب
برج آبی میں ہے مہیا ہر روشن آب میں (لطایف الشعراء)

لیکن مفتی صاحب نے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔
۳۔ گلشن بیخار، مولفہ شیفۃ، مطبوعہ رام پرشاد پریس دہلی ۱۸۳۴ء (نسخہ کتب خانہ حلیم مسلم کالج کان پور)
۴۔ گلشن بیخار، مولفہ شیفۃ ۱۲۵۹ھ، ایضاً مطبوعہ مطبع نول کشور اکتوبر ۱۸۴۳ء
۵۔ دیوان ذوق مطبوعہ مطبع نشی نول کشور کانپور جنوری ۱۸۴۱ء مرتبہ مولوی سید محمد اسماعیل صاحب مہتمم مطبع، ایضاً مرتبہ لالہ بشیر دیال صاحب مہتمم مطبع نشی نول کشور کانپور جنوری ۱۸۴۲ء (تصحیح تمام) دیوان ذوق مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ جون ۱۸۹۲ء (طبع ثانی) ایضاً مرتبہ ظہیر و انور وغیرہ مع تصحیح از شیخ محمد حفیظ اللہ حفیظ مطبوعہ مطبع احمدی ۱۸۶۲ء مرتبہ ۱۲۴۹ھ ایضاً مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور (نسخہ صحیح) سال ترتیب و سال طبع نامعلوم وغیرہ وغیرہ تذکروں کے متعلق کہا جاسکتا تھا کہ ان میں بیشتر غزلوں ہی سے اقتباس کرتے ہیں لیکن دیوان ذوق میں اس قصیدہ کا نہ ہونا بہت تعجب خیز ہے۔

دیکھئے یہ غزل تمام و کمال درج ہے، البتہ جس قصیدہ کا مولانا نے ذکر کیا ہے اس کا ایک شعر بھی ان میں کہیں نہیں مل سکا، معلوم نہیں کہ مولوی محمد باقر نے اس قصیدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا جب کہ ان کے فرزند مولوی محمد حسین آزاد کو پورا قصیدہ دستیاب ہو گیا تھا اور وہ اسے داخل دیوان بھی کر چکے تھے، غزل مذکور کا مطلع یہ ہے :-

مے ملا کر ساقیان سامری فن آب میں کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں
ایک قصیدہ کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہے :-

”یہ قصیدہ مبارکبادی مرزا سلیم شاہزادہ کی شادی میں لکھا تھا بندہ آزاد ان دنوں طفل مکتب بھی نہ تھا۔ جب حاضر خدمت ہونے لگا تو حضرت مرحوم اکثر اس کے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ ڈھونڈنے کی فرصت نہ تھی ایک برس وفات سے پہلے فرمایا کہ اگر ہوتا تو اسے درست کرتے۔ طبیعت نے عالم جوانی میں بلند مضامین پیدا کئے تھے خیر اکثر اشعار اور مطالب خیال میں ہیں ایک قطعہ لکھ دیتے ہیں، چنانچہ ۲۲ شعر کا قطعہ لکھا اور عید قربان کی تہنیت میں ابو ظفر بہادر شاہ کو سنایا بعد انتقال کے یہ قصیدہ بھی نکلا الحمد للہ کہ یہاں تک پہنچا۔“

مطلع :-
دل کہ اس دہر میں ہے گرسنہ ناز بتاں حم سیخ غنیمت ہو کہ اسکو دیکھا لب تاں
یہ قصیدہ دیوان ذوق میں تحریر ہے، لیکن اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں مل سکا جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ مرزا سلیم کی شادی میں لکھا گیا تھا۔ البتہ ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ مرزا سلیم کے والد اکبر شاہ ثانی کی مدح میں لکھا گیا تھا اور کسی خاص جشن کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔

بھر تو کر غور کہ مراح ہے کس شاہ کا تو وہ شہنشاہ کہ جشن اس کا ہے افلاک کی سیر
... آج عالم کا ہے دل شاد کہ جوں عالم نور
اوہ فرخندہ لقب شاہ محمد اکبر
... تجھ کو یہ جشن مبارک ہو بصد جاہ و جلال
و گیک وہ ابر کرم قلزم جود و احساں
نہتے جوش ہیں تو کرتے ہیں ستائے افشاں ...
جلوہ گر ہے سراورنگ بصد شوکت و شاں
ماج شاہان زماں فخر سلاطین جہاں ...
عقل ہو پیر تری بخت رہیں تیرے جواں

مولانا محمد حسین آزاد ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے اور ان کے بیان کے مطابق یہ قصیدہ اس وقت کی تصنیف ہے جب آزاد ”طفل مکتب بھی نہ تھے“ لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کی پیدائش ہو چکی تھی، ۱۹۳۲ء میں ذوق کی عمر چالیس (۴۰) سال

۱۔ اس غزل کے بعض اشعار میں بھی اختلاف ہے مثلاً صحیح اشعار اس طرح تھے :-

صحبت صافی دلائل سے ہوں مکر تیرہ دل صحبت اہل صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں
سایہ سر و چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے سایہ سر و چمن نے کیا ڈرایا ہے مجھے
خط کو ہم لکھنے جو بیٹھے آنکھ سے اٹھ پاشک خط کو ہم لکھنے کو بیٹھے آنکھ سے اٹھ پاشک

(گلشن بنجار (۱۳۵۹ھ) دیوان ذوق مرتبہ دیران وغیرہ)

لیکن دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں اس طرح تحریر ہیں :-

صحبت اہل صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں صحبت اہل صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں
سایہ سر و چمن نے کیا ڈرایا ہے مجھے سایہ سر و چمن نے کیا ڈرایا ہے مجھے
شب جو ہم لکھنے کو بیٹھے آنکھ سے اٹھ پاشک شب جو ہم لکھنے کو بیٹھے آنکھ سے اٹھ پاشک

سے بھی زاید تھی، اس عمر کو "عالم جوانی" مشکل ہی سے کہا جاسکتا ہے، بہرِ نوع اگر زمانہ کے اس تعین کو صحیح خیال کیا جائے تو اس قصیدہ کو اکبر شاہ کی مدح کے قصیدوں میں تقریباً آخری سمجھنا چاہئے کیونکہ ۱۸۳۳ء میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

بائیں شعر کی نظم کو زیر بحث بیان میں قطعہ کہا گیا ہے لیکن دیوان ذوق کے دیگر مرتبین نے اس کو قصیدہ کا نام دے کر داخل دیوان کیا ہے، لیکن دونوں کے اکثر اشعار میں کافی فرق ہے۔
مطلع :- خسرو جلوہ ترا وہ طرب افزائے جہاں کہ تجھے دیکھ کے ہو عید بھی قرباں قرباں،

مصرعہ ثانی میں دیوان ذوق مرتبہ آزاد (۱۹۳۳ء) میں "تجھے" کی جگہ "جسے" لکھا ہے اور اس کے بعد کے پانچ شعر بالکل وہی ہیں، پھر چھپا شعر اس طرح ہے :-

اور گہر بھی ہوں وہ خوش آب جنیں دیکھ کے ددِ طرفۃ العین میں ہو کاہِ اربا کویرِ تار
آزاد نے دوسرے مصرعہ میں "کو" کی جگہ "کا" لکھا ہے، اس کے بعد دو شعر کا ایک قطعہ ہے۔ پہلا شعر یہ ہے :-

نطق شہیں ترا وہ ہے کہ ثنا میں جس کی ترزاں موجِ دریا ہو اگر ایک زباں
بعض مرتبین نے اس شعر کو اسی طرح لکھا ہے، دوسروں نے پہلے مصرعہ میں "جس کی" کی جگہ "اس کی" تحریر کیا ہے، آزاد کے نزدیک "اس کے" چاہئے تھا۔ قطعہ کا دوسرا شعر وہی ہے اس کے بعد ایک شعر یہ ہے :-

اس قدر تابع فرماں ہے زمانہ تیرا ہونہ گلشن میں بھی روئیدہ گلِ نافرماں
آزاد کے مرتبہ دیوان ذوق میں دوسرے مصرعہ میں "ہونہ" کی بجائے "نہ ہو" تحریر ہے، پھر اگلے دو شعر ہیں ویسے ہی تیسرا شعر یوں ہے :-

وہ ترا زور حمایت ہے کہ جس کے باعث ناتوانوں کو بھی ہے دہر میں وہ تابِ دتواں
آزاد نے مصرعہ ثانی میں "ہے" کی جگہ "ہو" تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد پھر تیسرا شعر یہ ہے :-

پیل تیرا گلِ سوسن کا بڑا ایک انبار گلِ مہتاب کے گلدستے ہیں اسکے دندان
آزاد کے مطابق "بڑا ایک انبار" کے عوض "پڑا ہے انبار" صحیح تھا۔ پھر دوسرا شعر اس طرح تھا جس میں آزاد نے "اشہب" کی جگہ "جنش" لکھا ہے :-

لکھوں شوخی جو تیرے توسن چالاک کی میں، اشہب خامہ بھی ہو موجِ رم برقی جہاں
ایک شعر کے بعد یہ اشعار ہیں :-

اے فلک جاہِ ترے در کے ہیں وہ ذرہ خاک جن سے خورشیدِ جنے اپنی جہیں پرافشاں
طبع رنگیں میں ترے وہ چمنِ لالہ و گل روبرو جس کے ہے گلزارِ ارم خارستاں

۱۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے :-

مدح حاضر کے لئے حاضر دربار ہو ذوق تو ہے خاقانی ہند اور وہ خاقانِ زمان

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جشن سے پہلے ذوق کو خطاب "خاقانی ہند" عطا ہو چکا تھا، اور اس کا اس قصیدہ میں ذکر اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ خطاب پائے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ لیکن آزاد ہی کا بیان ہے کہ "بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب اس وقت عطا کیا جب شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی" (دیوان ذوق ۱۹۳۳ء ص ۱۵)۔ زمانہ کے تعین میں ان دونوں بیانات کا یہ فرق بھی بہت اہم ہے۔
۲۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد ۱۹۳۳ء

یہ دونوں اشعار آزاد نے نہیں لکھے، دوسری ترتیبوں میں تحریر ہیں، ایک شعر یہ ہے
 عید اضحیٰ تجھے ہر سال مبارک ہووے تجھ پہ ہو سایہ حق اور ترے سایہ میں جہاں
 آزاد نے اس کو تمام اشعار کے بعد لکھا ہے اور اس کے بعد کا شعر بالکل نہیں لکھا ہے
 تیرے ہاتھوں سے کہاں ہو جو سعادت اندوز کیا تعجب ہے کہ ہو رشک ہما زاغ کہاں
 پھر یہ تین شعر ہیں

قہر نازل ہو فلک سے جو ترے اعدا پر چشمہ مہر ہو مانند تنور طوفاں،
 اس طرح عدل سے ہے تیرے ہم آتش و آب جس طرح آئینہ میں عکس رخ شعلہ رنھاں
 تیرے احساں سے ہر انسان ہے غلامی میں تری سچ کہا ہے کہ الانسان عبید الاحساں
 یہ تینوں اشعار بھی آزاد نے قطعاً مذکور میں شامل نہیں کئے ہیں بلکہ ان کو قصیدہ اول الذکر (در مدح اکبر شاہ) میں ذرا تبدیلی
 کے ساتھ تحریر کیا ہے وہ بھی نقل کئے جاتے ہیں

تیرے مہتاب کرم سے جو سر تلزم قہر پردہ نور میں ابلا ہے تنور طوفاں
 عدل نے تیرے دکھائے ہیں ہم آتش و آب آب آئینہ میں روشن ہے رخ برق و شاں
 کیوں نہ ارباب ہم ہوں تری ہمت کے غلام حق یہی ہے کہ الانسان عبید الاحساں
 پھر ایک شعر یہ ہے

دل میں تو جوش مضامین ہے نہایت لیکن دل حوادث سے زمانے کے ہے بے تاب و توان
 آزاد نے اس کو قطعہ کے ساتھ ہی لکھا ہے لیکن اس طرح
 دل میں ہے جوش مضامین تو نہایت لیکن دل حوادث سے زمانے کے ہے بے تاب و توان

پھر مقطع پر قصیدہ ختم ہوا۔

البتہ وہ قصیدہ جو بقول آزاد ذوق نے مرزا سلیم کی شادی کے موقع پر پیش کیا تھا ان قدیم ترتیبوں میں نہیں ملتا، معلوم
 نہیں کیا سبب ہوا کہ بجز آزاد کے کسی مرتب کو وہ دریافت نہ ہو سکا۔

بعض قصاید کی ابتداء میں آزاد کے بیانات بھی تحریر ہیں جن کی صحت مشکوک ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ پر یہ عبارت تحریر ہے:-
 "اس قصیدہ پر بھی نظر ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے۔"

حالانکہ یہ قصیدہ مرزا جہانگیر شاہزادہ کی تقریب شادی کے موقع پر لکھا گیا تھا جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے
 شہا ہے آج اسی شاہزادہ کی شادی جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار

ایک بات یہاں اور عرض کر دوں، مدحیہ قصیدہ ہمیشہ کسی تقریب خاص کے لئے لکھا جاتا ہے جب اس تقریب پر پیش کیا
 جاتا تو اس کا مقصد پورا ہو گیا، تقریب گزرنے کے بعد نظر ثانی کرنا قصیدہ کے مقصد کے تحت کچھ زیادہ اہم نہیں، (خواہ ادبی طور
 پر اس کی کچھ بھی قیمت ہو) پھر یہ کہ شاعر کسی تقریب پر قصیدہ (اسی صورت میں پیش کرے گا جب وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو،

۱۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد (۱۹۳۳ء) ص: ۲۸۵۔

۲۔ مرزا جہانگیر شاہزادہ نے ۱۸۱۱ھ میں مسٹر سٹین (ریڈنٹ دہلی) کی جان لینے کا قصد کیا، چنانچہ گرفتار ہو کر الہ آباد میں قید رہے اور

۱۸۲۶ھ کو وہیں انتقال کیا۔ (واقعات دارالحکومت دہلی - ۱۹۸۱ء)

چنانچہ قصیدہ پر نظر ثانی نہ ہونے کی شکایت کوئی وزنی بات نہیں۔

قصیدہ مذکور کے آخری شعر میں شاعر نے نہایت خوبی کے ساتھ تاریخ بھی کہی ہے۔

کہو سرلب بستہ سے شادی فرزند مبارک آپ کو ہواے شہ سپہر وقار

۲ × ۳

۱۱۹۳ = ۱۲۲۵ھ

بعض مواقع پر صرف ایک لفظ کی تبدیلی بھی مضمون کو یکسر بدل دیتی ہے اور اس سے شاعر کے متعلق عجیب رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ایک شعر تھا۔

مایل موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت

مصرعہ اولیٰ میں "مائل" کی جگہ آزاد نے "ماہر" لکھا ہے، یہ معمولی تبدیلی ذوق پر خود ستائی کا الزام عائد کئے جانے کے لئے کافی ہے، چنانچہ آج کی اکثر تنقیدیں ان ہی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں۔ مثال کے طور پر میں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب کے مضمون "ملک الشعراء ذوق" سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں :-

"سوائے ایک دو ابتدائی غزلوں کے کہ جب تک وہ (ذوق) بادشاہ کے ڈگر نہیں ہوئے تھے ان کے کلام میں کہیں اپنے زمانہ سے کوئی شکایت نہیں ملتی اور بہادر شاہ خود شاہ شطرنج ہو لیکن ان کے لئے سلطان شجر سے کم نہ تھا۔"

مثال میں یہ دو اشعار پیش کئے گئے ہیں۔

در مضمون ہیں ترے ذوق زبیں پیش بہا کم کوئی ان کا خریدار نظر آتا ہے،
قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق و گرنہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کا نہیں آتا

قبل اس کے کہ میں ان دونوں اشعار سے بحث کروں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذوق اور بہادر شاہ کے تعلق کو بیان کر دوں۔

ہر صاحب فن کو قدر شناس کی تلاش ہوتی ہے اور کسی واقعی قدر دان کی سرپرستی حاصل ہونا گویا ترقی کی ضمانت ہے۔ سلطان شجر کی قدر دانی اور اس کا جاہ و حشم مشہور ہے، انوری کو اس کی سرپرستی حاصل تھی، سلطان شجر نے انوری کی لیا کی اتنی قدر کی کہ دو بار خود بآں جاہ و حشم انوری کے گھر گیا، نتیجہ یہ ہے اپنے میدان میں انوری بے مثال ہوا، ذوق ابتدا ہی سے بہادر شاہ کے دامن دولت سے وابستہ رہے، مولانا محمد حسین آزاد کا بیان اس موقع پر اہمیت سے خالی نہیں کہ :-

"جب تک اکبر شاہ زندہ تھے ان کا دستور تھا کہ قصیدہ لکھ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولی عہد بہادر (ظفر) کو سناتے، دوسرے دن ولی عہد مدوح اس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلو کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سنواتے۔"

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ذوق کے جو قصاید اکبر شاہ کی مدح میں ہیں وہ بھی گویا بہادر شاہ کی مدح میں لکھے گئے تھے، بہادر شاہ کی عنایات اور شفقتیں بھی ذوق کے ساتھ بہت تھیں اور انھوں نے ہمیشہ اپنے استاد کی ترقی ہی کی کوشش کی جسکی مثال وہ دستور بھی ہے جو بیان ہوا، ایسی صورت میں بہادر شاہ کی حیثیت بلاشبہ ذوق کے لئے وہی تھی جو انوری کے لئے سلطان شجر کی،

چنانچہ خود ذوق اپنے ابتدائی قصیدہ میں کہتے ہیں :-

خضر نصیب کی گردنیا میں رہبری ہو
اور شاہ راہ دل پر چشم ہنروری ہو ---
تجہ کو خبر نہیں کیا ہے دور شاہ اکبر
رفعت سے بہت جس کی شان سکندری ہو ---
اس کی نظر چڑھیں گریہ تابدار گوہر
پھر نام تیرا روشن ، مانند انوری ہو
تب بحر فکر میں دل غواص ہو کے اُترا
معلوم تاکہ سب کو زور شناسوری ہو

ایک ابتدائی قصیدہ کے یہ اشعار خود اعلان کر رہے ہیں کہ ذوق نے ”شاہ اکبر“ کی دعا گوئی محض اس لئے اختیار کی تھی کہ وہ ”بحر فکر“ میں اپنا ”زور شناسوری“ سب پر ظاہر کرنا چاہتے تھے ، اس قصیدہ گوئی کا مقصد جھوٹی اور لغو خوشامد کے بجائے اپنے ”ہنر“ کو ترقی دینا اور اس میں رفعت حاصل کرنا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مواقع پر ذوق کے قصاید میں مبالغہ انتہائی درجہ تک ملتا ہے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان کو جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو محبوب کا ہر عیب ہنس اور اس کی ہر خامی خوبی معلوم ہوتی ، چنانچہ ذوق کے ساتھ بھی یہی تھا خود ظفران سے محبت کرتے تھے اور جا بجا اپنے اشعار میں انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے ، حتیٰ کہ ایک مقطع میں کہتے ہیں :-

بختے ہے ظفر اپنے کچھ ذوق عجب دل کو ہم ذوق کا ہاتھوں سے دیوان نہ چھوڑیں گے

ظفر کی اس حقیقت کا جواب ذوق بھی اسی انداز سے دیتے ہیں اور خود کو ظفر کا ”محب یکرنگ“ قرار دیتے ہیں :-
ذوق جو ہے ترا مداح محب یکرنگ

اور خود دعا گوئی کا سبب اس طرح بیان کرتے ہیں :-

مگر یہ ذوق شائخ و مدح خواں تیرا ، غلام پیر کہن سال اک فقیر حقیر ،

کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ سنا ہے جب سے کہ رحم خدا دعائے فقیر ،

کچھ تو ذوق کی یہ محبت اثر دکھاتی تھی اور کچھ زور استدلال رنگ لاتا تھا اور اس طرح بعض اوقات ذوق انتہائی مبالغہ سے کام لیتے تھے ۔ مثلاً :-

انا اگر بلند ہی شان و شکوہ میں ہاتھی سے تیرے ہو بھی گیا ہم سر آسماں

پر اس کے نقش پا کی برابر بناسکے چار آفتاب ایک جگہ کیونکر آسماں

ذوق نے بہادر شاہ کو سلطان سنجہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن اس سے یہ خیال کر لینا کہ ذوق نے بہادر شاہ کا ”نوکر“ ہو جانے کے بعد اپنی زبان بند کر لی ، بالکل بے بنیاد ہے ، ذوق کے کردار کی کتنی بڑائی ہے کہ انھوں نے تمام عمر بجز اپنے مدوح خاص کسی شان میں قصیدہ نہیں لکھا (بجز ان قصیدوں کے جو مذہبی جذبات کے تحت لکھے گئے تھے) رہا پریشانیوں اور مشکلوں کا بیان تو قصاید ہی میں نہیں ، غزلوں کے متفرق اشعار اور مقطعوں میں بھی ذوق نے بسا اوقات اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے مثلاً :-

بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق ، تری زباں کا مزا تیری شعر خوانی میں

یقیناً بقول آزادؒ کا ہے کیونکہ آزاد کے قول کے مطابق نثار علی شاہ سے ذوق کی ملاقات اسی سال میں ہوئی تھی

اسی طرح ۷

ذوق کیونکر ہوا اپنا دیوان جمع، کہ نہیں خاطر پریشاں جمع،

یہ قطع ۱۲۵۹ھ سے پہلے کا ہے، زمانہ کا صحیح تعین نہیں کیا جاسکا۔ یہ دونوں قطعے بلاشبہ بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لینے کے بعد کے ہیں، ایسی صورت میں یہ اعتراض کہ بجز ابتدائی غزلوں کے وہ کہیں زمانے کی شکایت نہیں کرتے، صحیح نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں ایک اور قطع اسی قبیل کا بہت خصوصیت سے تحریر ہے۔ ذوق مرتبہ کیونکر ہوا دیوان شکوہ فرصت کس کس باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں آخر میں ان دونوں قطعوں کے متعلق بھی عرض کر دوں جو ہاشمی صاحب نے مثال میں پیش کئے تھے:-

۱۔ در مضمون ہیں ترے ذوق زبیں بیش بہا کم کوئی ان کا خریدار نظر آتا ہے
 پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق یہ قطع خود آزاد کا ہے، چنانچہ اس کی بنیاد پر جو رائے قائم کی جائے گی وہ ذوق کے متعلق نہ ہوگی۔

۲۔ قسمت ہی سے لاچار ہوں لے ذوق وگرنہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا
 یہ قطع جس غزل کا ہے اس کے متعلق خود مولانا آزاد کا بیان ہے کہ:-
 ”دلی میں نواب الہی بخش خان معروف ایک عالی خاندان امیر۔۔۔۔۔ تھے۔۔۔ میری (استاد ذوق کی) عمر ۱۹-۲۰ برس کی تھی۔۔۔ چوہدر آقا۔۔۔ کہا کہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے۔۔۔ استاد نے کہا۔۔۔ کہہ دینا پرسوں آؤں گا۔۔۔ تیسرے دن تشریف لے گئے۔۔۔ استاد مرحوم نے ان ہی دنوں ایک غزل کہی تھی، دو مطلع اس کے پڑھے:-

قبینا نظر اپنا ہمیں اصلاً نہیں آتا گر آج بھی وہ رشک میسا نہیں آتا
 مذکور ترمی بزم میں کس کا نہیں آتا پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق نے یہ غزل ۱۹-۲۰ سال کی عمر میں کہی تھی، اگرچہ ابھی یہ مسئلہ خود تحقیق طلب ہے کہ معروف، ذوق کے شاگرد ہوئے تھے یا نہیں، کیونکہ آزاد کے اس سلسلہ کے بیانات میں بعض

۱۔ گلشن بے خار ۱۲۵۹ھ میں یہ قطع نقل ہوا ہے، ۱۲۵۹ھ کی اشاعت میں نہیں ہے۔

۲۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد۔ ص ۱۳، ۱۱۲، ۳۱ وغیرہ۔ اس غزل کے متعلق اگرچہ پروفیسر شیرانی کی تحقیق ہیں کہ یہ ذوق کی تخلیق نہیں، لیکن تعجب تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے اس غزل کا خیال نہ کیا دراصل ایک ان کے پیش نظر مولوی محمد حسین آزاد ہی کا مرتب کردہ دیوان تھا۔ کیونکہ اس مضمون میں جو مثالیں انھوں نے پیش کی ہیں تقریباً سب ہی اسی سے نقل ہیں۔

۳۔ دیوان ذوق مرتبہ آزاد۔ ص ۸-۹۔

۴۔ یہ دونوں مطلعے گلشن بے خار مطبوعہ ۱۲۵۹ھ میں موجود ہے یقین ہے کہ اس سے پہلے کے ہیں، لیکن اس امر کی تصدیق کہ ۱۲۵۹ھ کے قریب (جب ذوق کی عمر ۱۹-۲۰ برس تھی) انھوں نے یہ غزل کہی تھی، نہیں ہو سکی۔

۵۔ خجاند جاوید وغیرہ مذکور ہیں معروف کے شاگرد ہونے کی سخت تردید کی گئی ہے البتہ تاریخ جدو سیر اور تذکرہ شمیم سخن سے آزاد کے بیان کی تائید ہوتی ہے، لیکن حقیقت کی دریافت کے لئے ہمیں قدیم تر عند تلاش کرنی ہے۔

باب الانتقاد

(غزل معنی)

(نیا فچوری)

مجموعہ ہے جناب سید آل رضا کی غزلوں کا۔ سید آل رضا ہمارے یو۔ پی ہی کے فرزند ہیں اور تقسیم ہند سے پہلے ہیں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور غزلیں بھی کہتے تھے۔ مجھے ان کی وکالت کا حال تو زیادہ معلوم نہیں، لیکن غزلیں وہ یقیناً بڑی اچھی کہتے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد جب وہ کراچی گئے تو یہ ذوق بھی اپنے ساتھ لے گئے جس نے رفتہ رفتہ ایک دیوان کی صورت اختیار کر لی۔ موصوف جب لکھنؤ میں تھے تو اس وقت بھی ۱۹۴۹ء میں ان کی ابتدائی غزلوں کا مجموعہ نوائے رضا کے نام سے شائع ہوا تھا اور میں نے اسے بہت پسند کیا تھا، کیونکہ سرزمین لکھنؤ سے اٹھنے والی یہ بالکل پہلی صدائے تغزل تھی جو ”آہنگ شاد عظیم آبادی“ سے ملتی جلتی تھی۔ اس لئے اب تیس سال کے بعد ان کا یہ دوسرا مجموعہ کلام میرے سامنے آیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے اس سے کافی لطف اٹھایا۔

سید آل رضا، حضرت آرزو لکھنوی کے شاگرد اور اس وقت جلال لکھنوی کے مکتبہ فکر کے تنہا نایندے ہیں۔ حضرت آرزو لکھنوی کے شاعر تھے اور شاد عظیم آبادی صوبہ بہار کے، لیکن جن حضرات نے ان دونوں بزرگوں کے کلام کا مطالعہ کیا ہے ان سے حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ لب و لہجہ اور اسلوب بیان کے لحاظ سے آرزو و شاد دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب آئے اگر سید آل رضا کے کلام میں شاد کا رنگ زیادہ نمایاں ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

سید آل رضا نے دیوان کے دیباچہ میں صنف غزل کی خصوصیات کا ذکر بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے، جن کو سامنے رکھ کر ہم آسانی سے رضا کی شاعرانہ انفرادیت متعین کر سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ان کے کلام کی اس کا لکھنوی لب و لہجہ اور اس کی لکھنوی بو باس ہے جو بہت سے لکھنوی شعراء کے یہاں بھی نہیں پائی جاتی، دوسری خصوصیت اس کا DIRECT APPROACH ہے یعنی تیرا امد نشانہ پر بیٹھ گیا تیسری خصوصیت اس کا والہانہ لب و لہجہ ہے، چوتھی خصوصیت جذبات کی پاکیزگی و لطافت اور ندرت تعبیر ہے، پانچویں خصوصیت بیانی کا خلا یعنی ادھوری بات کہ کر اس کو پورا کرنا ذہن سامع پر چھوڑ دینا۔ یہ انوٹ مومن کی خصوصیت ہے اور آل رضا کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

یہ ہیں وہ خصوصیات جن پر رضا کی شاعرانہ انفرادیت قائم ہے جسے اگر آپ چاہیں تو اشارات لطیف اور صحیح وار و اب محبت کی کی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ رضا کا رنگ تغزل کتنا لطیف و پاکیزہ ہے۔

جو نظری تو یہ سوچ تھا کہ سوال آپ سے کیا کروں
جو کیا سوال تو سوچ ہے کہ جواب آپ نے کیا دیا

ان سے عہد ترک تکلم
 آپ تو جیسے اپنی بازی
 چھیڑ دی ظلم کی توجہ سلامت رہے
 ہم نے بے اختیار وفا کر کے
 کھلے ہیں پھول جو ایسے میل تم چلے آتے
 بھری بہار کے دن میں خیال آ ہی گیا
 مجھے حق ہے انکے دل پر، یونہی فرض کر لیا تھا
 یہ کیوں کہوں کہ میرا قرار ہو نہ سکا
 جوش طوفان نہ اترائے ابھی عالم آس
 کس سوچ میں ہے ہو آنے والے
 کیا کہنے جاؤں ان کے در پر
 جو آپ وجہ نہ پوچھیں تو ایک بات کہوں
 یہ اور بات ہے، جب بھی اٹھائے جاؤں
 ہوا کے رخ پہ سنبھل کر چلی تو تھی کشتی
 طال کو تھی یہ ضد، اب ترا خیال نہ آئے
 بس یہی تھا ان کو پتہ دل پہ ناز
 وضع خود داری نہ با ہی تو مگر
 بناتے ہی چلے جاتے ہو دیوانا تو کیا ہوگا
 محبت میں بہت کچھ آگئی دیوانگی، لیکن
 یونہی بیانی میں اس محفل سے اٹھ جانا پڑا
 زندگی کی تلخی بیچارگی کو کیا کہوں
 کیا عجب، کچھ بن کھلی کلیوں نے سوچا ہو رضا
 کھلتے پھولوں کی یہ کہانی دل کو نہ کیوں تر پائے بہت
 کچی کلیاں توڑ کے رکھ دیں پانی میں کھیل اٹھنے کو
 پہلو میں ہے بس اتنی اب یادگار دل کی
 سرکٹنا ہی ٹھہرا جو محبت کی نظر پر
 واسطہ کوئی نہ رکھ کر بھی ستم ڈھاتے ہو تم
 ان نگاہوں کے بدل دینے پہ قادر ہو مگر
 نہ سہی علاج غم رضا تو لے مزاج ہی کم سے کم
 اُن سے مجتبیٰ یہ بھی گوارا
 اپنی بازی میں کب ہارا
 شرم آئی بھی تو آیا نہ پیشیاں ہونا
 بے وفائوں سے انتقام لیا
 یہ اہتمام بہاراں نہ رائیگاں جاتا
 اُجڑنا جاتا تو پھولوں میں آشیاں ہوتا
 مگر اب رضا ہے مشکل یہ خیال آ کے جانا
 سکون دل پہ مگر اعتبار ہو نہ سکا
 ڈوبنا بھی ہمیں آتا ہے جو ساحل نہ رہا
 ٹھہرا رہے گا جیسے زمانہ
 کہنا یہی ہے "پھر دل نہ مانا"
 بغیر آپ کے مجھ سے جیسا نہیں جاتا
 تمہاری بزم سے لیکن اٹھا نہیں جاتا
 مگر وہ رخ تھا کہ طوفان ہی اٹھا کے رہا
 خیال آ کے رہا اور طال جا کے رہا
 ظلم فرمائیں! ترس کیوں آگیا؟
 اے رضا دانتوں پسینا آگیا
 یہ ان سے پوچھتے لیکن برا مانا تو کیا ہوگا
 محبت جس نے پہلے کی وہ دیوانہ رہا ہوگا
 کیا کہوں، پھر کیا ہوا جب دل کو سمجھنا پڑا
 لذتیں کتنی تھیں جن کو بھول ہی جانا پڑا
 کھیل کے کیا ہوگا اگر کھلتے ہی مرجھانا پڑا
 شاخوں پر کم رہنے پائے، ہاتھوں میں کھلائے بہت
 یوں جو تمناؤں سے کھیلے، کھیل کے ہم بچھپائے بہت
 پہلے پہل اٹھا تھا اک درد سا یہیں پر
 ہو جائے رضا ایک محبت کی نظر اور
 کچھ نہیں تو یاد ہی آئے چلے جاتے ہو تم
 یاد رکھنا آج سے میرے ہوئے جاتے ہو تم
 یہ ہے دل کے درد کا رنگ کیا نہ تم سے کم نہ کم سے کم

چھپ نہیں سکتی چاہ کی چتون روز کہاں تک بات بنائیں
 بلکوں پر کیوں آنسو ٹھہرے تم تو نہ آئے، کس کو بتائیں
 دیکھ رہے ہو دل کی حالت پوچھ رہے ہو آگ لگا ہیں؟
 ہم سے رضا انھوں نے یہ تو نہیں بتایا "کیوں یاد آ رہے ہیں۔ بس یاد آ رہے ہیں
 اہل نفس قبول ہوتا زہ اسیر کا سلام ہم سے بھی چھٹ گیا چمن اب کے برس بہار میں
 آپ کی بزم میں آنے کا نتیجہ معلوم کل چلے آئے تھے پھر آج چلے آئے ہیں
 اب جو پلیٹیں تو پلیٹے کہیں بنتا ہے رضا راہ الفت میں بڑی دور نکل آئے ہیں
 تم نے تو ہنس کر آنکھ جھکا لی چھو گئیں آ کر دل کو نگاہیں
 سب بدل جائیں ہم نہ بدلیں گے اس کو بھی انقلاب کہتے ہیں
 کتنی آبادیاں ہیں اس دل سے جس کو خانہ خراب کہتے ہیں
 کبھی ہو سکا ہے حساب محبت کہاں تک گنو گے ہماری خطائیں
 آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے چھوڑے بھی اب غریب آزاریاں
 سوچنے لگتا ہے جب نام ترا آتا ہے ابھی باقی ہے سمجھ تھوڑی سی دیوانے میں
 پردہ اٹھ جانے پر مٹ جائے گی لے حسرت دید وہ جواک بات ہے بجلی سی چمک جانے میں
 جو نظر پھیر کے خوش ہوتے ہیں وہ کیا جانیں کیا ہوا کرتا ہے منہ دیکھ کے رہ جانے میں
 بس اتنی بات پہ طوفان ابرو باد آیا یہ کون چین سے بیٹھا ہے آشیانے میں
 پوچھیں کس حق سے "بٹھا کر کیوں اٹھاتے ہو ہیں" یہ بھی کوئی خاص طرز بزم آرائی نہ ہو
 یہ دیکھنا ہے عقوبت کی شکل کیا ہوگی مری نگاہ محبت کا انتقام تو لو
 سمجھوں جفا کا قصد کہ ترک جفا کا قصد یہ شوخیاں نگاہ پشیاں کے ساتھ ساتھ
 دامن چھڑانے والے زرا باتھ روک کے کھینچتی ہے روح جنبش داماں کے ساتھ تھکا
 جھپک نہ جائیں کسی وقت منظر آنکھیں چلے بھی آؤ بہت راستہ دکھایا ہے
 آج تو اس نے میرے دل کا درد سن لیا اور ہنسی نہیں آئی
 جتنے اظہار محبت کے طریقے ہیں رضا کم سے کم اتنی ہی قسمیں بھی ہیں دیوانو کی
 کون رضا اور کیسی محبت کوئی کہتا تم تو نہ کہتے
 جہاں پہ آ کے ملے اتفاق سے دو دل وہیں سے راہ نکلنے لگی جدائی کی
 شمع نے لودھی شہر شمع پروانے ہوئے آپ کیوں محفل میں بیٹھے ہیں ہرمانے ہوئے
 دل کو بھی کیا شوق کی منزل سے ہوتا ہے لگاؤ راستے ملتے چلے جاتے ہیں پہچانے ہوئے
 سوچئے تو حسن کا فرکچہ نہیں دیکھئے تو دیکھتے رہ جائیے
 اے شانِ کرم، اے جانِ چمن اس جنت کو کیا کہیں جب یاد تری آتے آتے پھولوں کی جھک بن جاتی ہے

میں نے بے قصد بھی لوٹی ہے یہ جلوں کی بہار — مرگئیں آپ نگاہیں وہ جدھر سے گزرے
 ہیں اب طوفان کے قبضہ میں جس کشتی کے ہچکولے — اسی میں سو رہے ہیں خواب ساحل دیکھنے والے
 سمجھا کے تھک گئے دل خانہ خراب کو — رہنے دے ان کو اور زرا بے خبر ابھی
 جاؤ مگر ابھی تمہیں رخصت نہیں کیا — دیکھو گے کیا نہ ایک نظر پھر ادھر کبھی
 وہ آئے یاد کھلا بھول، پیر من ہکا — کھڑے ہوں جیسے ابھی سامنے گلے مل کے
 ہاں چلے جانا مگر آتے ہی کیوں چھڑا یہ ذکر — اور کچھ باتیں کرو پھر ہے دم بھر دل ابھی
 کب آپ نے امید دلائی کوئی مگر، — کیوں دیکھتا ہوں آپ کی صورت نہ پوچھتے
 رضا جب تک نہ سمجھے تھے محبت کے تقاضوں کو — ہمیں بھی شوق رہتا تھا کوئی امید بر آئے
 اتنا ہی کہہ دو کہ اپنا جان کر توڑا ہے دل — تم سلامت کچھ ہماری بھی خوشی ہو جائے گی
 چھڑتے ہو جو کسی دل میں چھپی پھانسیوں کو — جانتے بھی ہو کہاں تک یہ کھٹک جاتی ہے
 اکبار ان کو دیکھا تھا صحنے قریب سے — وہ اتنے ہی قریب رہے ہم جہاں رہے
 شعلے اب اپنے بس کے نہیں آؤ جل مریں، — جب تک تھے پر بجائے ہوئے آشتیاں رہے

اس اقتباس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ رضا کتنے خوش فکر شاعر ہیں اور انداز بیان میں دوسرے غزل گو شعراء سے وہ کتنے متمایز ہیں۔ لیکن ان تمام محاسن کے باوجود ان کا کلام نقایص سے پاک نہیں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ شعر کہہ کر دوبارہ اس پر غور نہیں کرتے۔ مثلاً:-

- ۱- رضا ہم اور ابھی ان کی راہ دیکھیں گے جنہیں ہے شوق کہ ہم اور انتظار کریں
 دوسرے مصرعہ میں ”جنہیں ہے شوق“ کا ٹکڑا ردائی شعر کو کم کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا:-
 جو چاہتے ہیں کہ ہم اور انتظار کریں
- ۲- تم رضا بن کے مسلمان جو کافر ہی رہے تم سے بہتر ہے وہ کافر جو مسلمان نہ ہوا
 پہلے مصرعہ میں جو کی جگہ بھی ہوتا تو شعر کا جھول بھی مٹ جاتا اور بیان میں زور بھی پیدا ہو جاتا۔
- ۳- تو سمیع کی بڑھتی ہے یونہی اور بڑھے جائے پروانے چلے جائیں گے پروانے بہت ہیں
 پہلے مصرعہ میں یونہی کی جگہ تو کیا ہونا چاہئے۔
- ۴- گزر گئی جو گزیرنا تھی اب گلہ بھی نہیں تمہیں پکار کے ہم تھک گئے، سنا بھی نہیں
 کس نے نہیں سنا؟ - تم نے کا اظہار ضروری تھا۔
- ۵- پانی تو بہ افراط مگر اُن یہ تکلف کیا خانہ مفلس میں لگی آگ بجھا بیٹیں
 اول تو افراط غزل کی زبان نہیں، دوسرے یہ کہ جب تک اس کے بعد ہے یا تھا نہ کہا جائے مفہوم پورا نہیں ہوتا۔
 دوسرے مصرعہ میں بجھا بیٹیں کا فاعل مخدوف ہے اور پہلے مصرعہ میں بھی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں، اس لئے اگر پہلا
 مصرعہ یوں ہو جائے تو یہ دونوں نقص ختم ہو جاتے ہیں:-
 ”پانی تو بہت ہے مگر اُن کو یہ تکلف“

۶- زائد ہے - یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا:- ”بارہا لوٹی ہے بے قصد بھی جلوں کی بہار“

- ۶- لذتوں کا یہ دورِ رُخِ عمل، جب کہ ہر شے سے وقتِ رخصت ہے
دوسرے مصرع میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ”جب ہر شے سے رخصت کا وقت آگیا“ لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔
- ۷- لپٹی رہی شباب کے ہاتھوں متاعِ ہوش ہم اپنے، اتنی دیر نہ جانے کہاں رہے
دوسرے مصرع میں ”ہم اپنے“ کا محمل استعمال سمجھ میں نہیں آیا۔
- ۸- درِ حبیب ملا، سر جھکا کے بیٹھ گئے ہزار سجدے تھے کس کس کو ہم ادا کرتے
محاورہ ہے سجدہ ادا کرنا کہ سجدہ کو ادا کرنا، اس لئے دوسرے مصرع میں کس کس کو، محمل نظر ہے۔
- ۹- ارے یہ شوق، کہ اپنا انھیں کہا کرتے مگر یہ ضد کہ اجازت وہ خود عطا کرتے
پہلے مصرع میں فاعل غائب ہے اور دوسرے مصرع میں فعل ہمارا۔ دوسرے مصرع میں کہ کی جگہ ہے لکھا جاتا تو دوسرے مصرع کا نقص دور ہو جاتا۔
- ۱۰- رکھئے زرا سنبھال کے تیوری چڑھی ہوئی ہونٹوں پہ ہے ہنسی، یہ کوئی برہمی ہوئی
”سنبھال کر رکھئے“ اردو کا محاورہ ضرور ہے لیکن تیوری کے متعلق یہ کہنا کہ ”سنبھال کر رکھئے“ درست نہیں، ”تیوری سنبھالنے“ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ”تیوری سنبھال کر رکھئے“ کہنا نا درست ہے۔
- ۱۱- فرضِ مراغت کے تصور میں بھی رضا ہم سے کبھی آدا نہ کوئی دشمنی ہوئی
”دشمنی ادا ہونا“ کوئی محاورہ نہیں۔ لفظ آدا شاید انھوں نے سرزد کے معنی میں استعمال کیا ہے۔
- ۱۲- اب اشارے سے بھی قاصر ہیں تھکے دستِ دعا یہ بھی ساتھی ہیں مری بیٹی ہوئی آواز کے
اس شعر کا انداز بیان بہت الجھا ہوا ہے، شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب دستِ دعا تھک گئے تو اشاروں سے بھی کام لینے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی حالانکہ بیٹی ہوئی آواز کے ساتھی یہی اشارے رہ گئے تھے۔ اس صورت میں بھی اور ہیں دونوں بیکار ہیں۔ کہنا یوں چاہئے تھا کہ ”تھے یہی ساتھی مری بیٹی ہوئی آواز کے“۔
- ۱۳- جنتِ کیف و سکون، سیائے دیوارِ حبیب دیکھ کر تجھ کو کڑی دھوپ سرک جاتی ہے
مصرعہ اول کا پہلا ٹکڑا یکسر آوری ہے اور دوسرے ٹکڑے کے ساتھ حرفِ ندا کا استعمال ضروری تھا۔
- ۱۴- اک پھول کبھی تو نے یوں ہنس کے دیا مجھ کو جو پھول کھلا جب سے وہ تیری نشانی ہے
پہلے مصرع میں یوں زائد ہے اس کو نکال دیجئے تو شعر کا مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔
- ۱۵- سکون بھی ہے کہیں اضطراب کیا جانے اک انقلاب، صد انقلاب کیا جانے
مصرعہ ثانی میں ”اک انقلاب“ کی جگہ ”خود انقلاب“ ہونا چاہئے۔
- ۱۶- ماتھے پہ تشکن، لبِ پنہی، حسنِ مدارات اپنا ہی لیا آپ نے اندازِ کرم بھی
اپنا لینا، اردو کا محاورہ نہیں لیکن اگر آج کل کے استعمال کے لحاظ سے اسے گوارا کر لیا جائے تو بھی یہ ”اپنا ہی لیا“ ٹھیک نہیں۔
- پہلے مصرع میں پنہی اور مدارات کے ساتھ ”ماتھے پہ تشکن“ کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا۔
- ۱۷- وہ چاہتے تھے مگر بزمِ ناز میں آکر سلام لے نہ سکے اپنے اہلِ محفل والے
دوسرے مصرع میں اپنے کہنے کا کوئی محمل نہ تھا۔

- ۱۸- محبت سے زیادہ لطف دے آمد محبت کی مگر ظالم کی آہٹ کیا کبھی معلوم ہوتی ہے شاعر کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کے آنے کی "آہٹ" محبوب کی آمد سے زیادہ پُر لطف چیز ہے۔ لیکن وہ اس خیال کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکا۔ خود محبوب کو محبت اور اس کی آہٹ کو "آمد محبت" کہنا درست نہیں۔
- ۱۹- جنوں کہئے، غموں کی انقلابی کیفیت کہئے خوشی ہوتی نہیں لیکن خوشی معلوم ہوتی ہے انقلابی کیفیت غزل کی زبان نہیں، پہلا مصرع یوں ہونا چاہئے :-
جنوں کہئے اسے یا غم کی کوئی خاص کیفیت
- ۲۰- یہ ہے دل کا کیا فسانہ کوئی سلسلہ نہ جانا کبھی کہہ دیا یہاں سے کبھی کہہ دیا وہاں سے پہلے مصرع کا دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے سے غیر مربوط ہے۔ نہ جانا کہنے کا کوئی محل نہ تھا، اگر یہ کہا تھا تو اس کا فاعل بھی ظاہر کرنا ضروری تھا۔
- ۲۱- شدت وہ درد میں کہ الہی ترمی پشنا نازک مزاج صاحب درماں نئے نئے دوسرا مصرع پہلے سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔
- ۲۲- ہمدردیوں میں درد کے سماں نئے نئے کیا کیا ہیں اک غریب پہ احساں نئے نئے کیا کیا کہنے کے بعد نئے نئے کہنے کا کوئی محل نہ تھا۔ پہلے مصرعہ میں فعل غائب ہے۔
- ۲۳- احساس محبت اور وہ جس کی اس پر سچی آنکھوں میں کیا حسن تصرف ہوتا ہے جب موتی میں آب آتی ہے حسن تصرف کا استعمال صحیح نہیں۔
- ۲۴- آنکھوں کی فریبی لذت میں دل کو تہ و بالا کون کرے نااہل و فابیگانہ کو منہ دیکھے کا اپنا کون کرے فریب لذت یا لذت پر فریب کو فریبی لذت کہنا درست نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں منہ دیکھے کا اپنا سمجھ میں نہیں آتا۔
- ۲۵- اچھی آنکھوں سے جھانکنے کے لئے پورے چہرہ کی حسن سامانی شعر ناتمام ہے۔ کوئی مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ چہرہ کی حسن سامانی بھی کچھ نہیں۔ چہرہ میں حسن ہوتا ہے حسن سامانی نہیں۔ اور اسی طرح کی متعدد مثالیں نقص بیان و تعبیر کی کلام رضا میں ضرور پائی جاتی ہیں، لیکن محاسن کے مقابلہ میں نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں۔
- مجموعہ کا نام غزل معلیٰ مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ انھوں نے دیباچہ میں اس کی وجہ ظاہر کی ہے لیکن میرے نزدیک معقول نہیں۔ اس کا نام خصوصیات کلام کے لحاظ سے ہوائے گلشن، بوسے گل وغیرہ ہونا چاہئے تھا نہ کہ "بلغ العلیٰ" قسم کا ثقیل نام۔ یہ مجموعہ پانچ روپیہ میں مکتبہ افکار رابن ردڈ کراچی سے مل سکتا ہے۔

اگر آپ تاریخی، مذہبی معلومات چاہتے ہیں تو یہ لٹریچر پڑھئے

- خدا نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ تنقیح اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ فرمانروایان اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علوم اسلام و علماء اسلام نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ جوہی نمبر: قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔ (جلد ۱ و ۲) یہ پانچوں نمبر ایک ساتھ آپ کو مع محصول بمثل روپیہ میں مل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ قیمت آپ پیشگی ذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔
- میجر نگار لکھنؤ

صوفی فلاسفہ

(شیخ المقتول)

(نواب محمد عباس طالب صفوی)

سلطان المتاہلین^۱ عمر بن محمد السہروردی جو ۷۳۴ھ میں الزام زندقہ میں قتل کئے گئے۔ مشرق و مغرب کے محققین کی نظر میں "افلاطونی نظریہ تصورات میں قدیم ایرانی عرفانیت" کو شامل کرنے کے لئے مشہور ہیں، لیکن میں یہ سمجھنے سے یکسر قاصر ہوں کہ وہ قدیم ایرانی عرفانیت آخر تھی کیا چیز؟

اگر اس "قدیم ایرانی عرفانیت" سے مراد حضرت زرتشت کی تعلیم ہے تو خود پارسی مذہب کے محققین کو اعتراف ہے کہ جناب زرتشت کا مذہب عام مذاہب کی طرح ایک سیدھا سادہ مذہب تھا جس میں فلسفہ اور عرفانیت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔^۲ اگر اس قدیم ایرانی عرفانیت سے مراد مانی کے تعلیمات ہیں تو خود شیخ المقتول نے "کفار عجوس اور مانی" کے "قواعد" کو "کفر والحاد" کی طرف منجر کرنے والا سمجھا ہے اور اگر اس قدیم ایرانی عرفانیت سے مراد "قدیم حکماء فارس مثلاً جاماسب و فرشاد شور و بزر جمہر" کا فلسفہ ہے تو شیخ المقتول کے علی الرغم ان حکماء فارس کا تاریخی وجود بھی ثابت کرنا دشوار ہے چہ جائیکہ ان کا مزعومہ فلسفہ!

ہاں اگر اس "قدیم ایرانی عرفانیت" سے مراد ایرانی صنمیات ہیں تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ حکمت الاشراق ان صنمیات سے لبریز ہے اور نہ صرف حکمت الاشراق پر ایرانی صنمیات کا اثر ہے بلکہ ہیکل النور مصنفہ شیخ المقتول کے اس نسخہ سے بھی جسے مطبع السعادة مصر نے شایع کیا ہے اور جو شیخ المقتول کے "لڑکپن کی تصنیف ہے"۔^۳ یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ المقتول کو ادنیٰ عمر سے ایرانی صنمیات سے شغف تھا۔

ان ایرانی صنمیات کے زیر اثر کبھی شیخ المقتول نے آفتاب کی تعظیم کو طریقہ اشراق میں واجب سمجھا۔ کبھی ایرانیوں کے اس عقیدہ کو کہ ہر شے کا ایک رب النوع یعنی دیوتا ہے اس روایت سے منطبق کیا کہ ہر شے کا ایک فرشتہ ہے اور کبھی آگ اور تمام انوار کو

۱۔ "حکمت الاشراق" مترجمہ مرزا آقا مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۱

A History of the Arabs

۲۔ "حکمت الاشراق صفحہ ۱۔ ۲" قدردن دسلی کا اسلامی فلسفہ" صفحہ ۲۰

A History of Philosophy Eastern & Western Vol. 2 Page 2

۳۔ "حکمت الاشراق" مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳

واجب التعظیم قرار دیا۔^۱

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ شیخ المقتول کے فلسفہ میں ایرانی صنمیات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ حقیقت شیخ المقتول کا فلسفہ بھی دوسرے مسلمان فلاسفہ کی طرح نوافلاطونیت سے ماخوذ تھا اور اگرچہ شیخ المقتول نے حکمت الاشراق کے آخر میں یہ وصیت فرمائی ہے کہ اس کتاب کو صرف ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہئے جو مشائیں کے طریقہ میں پختہ ہو چکے ہیں۔ تاہم شیخ مشائیں سے متفق نہیں تھے اور اکثر مسائل میں انھوں نے مشائیں یعنی پیروانِ ارسطو کی شدید مخالفت کی ہے۔^۲

اس کے برعکس نوافلاطونیت کی حمایت صرف حکمت الاشراق میں موجود ہے بلکہ شیخ المقتول کے اوایل عمر کی تصنیف ہے، ہیاکل النور میں بھی نوافلاطونیت جلوہ فرما نظر آتی ہے اور اس تصنیف میں بھی کہیں نفس ناطقہ کو نور من النوار اللہ سے سمجھنے کے باوجود نفس ناطقہ کو خدا سے علیحدہ سمجھا ہے اور کبھی روح القدس کو عقل فعال سے تعبیر کیا ہے اور عقل اول کے متعلق خالص نوافلاطونی رنگ میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ”اول ما نشہب الوجود واول من اشرق علیہ نور الاول“ یعنی عقل اول ہی سے تخلیق کی ابتدا ہوئی اور اسی کو سب سے پہلے نور اول نے منور کیا۔

حکمت الاشراق میں کبھی عقل اول کو نور اقرب سے تعبیر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ”نور الاول اقرب کا نور اقرب پر طلوع ہوتا ہے“ کبھی ”الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد“ کے تحت یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ واحد حقیقی سے ایک ہی معلول صادر ہوتا ہے اور نور الاول سے وسایط کے بغیر ظلمت حاصل نہیں ہوتی۔ اور کبھی اسی ”الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد“ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اگر نور الاول سے نور اقرب کے سوا کچھ صادر نہیں ہوا اور نور اقرب سے ایک ہی برزخ حاصل ہوئی اور کوئی نور اس سے حاصل نہیں ہوا تو یہ سلسلہ وجود نور اقرب پر رک جائے گا اور کوئی شے انوار و اجسام سے حاصل نہیں ہوگی۔^۳

کبھی فلاطینس کے برعکس یونان کے دوسرے فلاسفہ کا متبع کیا گیا ہے اور کہیں ان فلاسفہ کا نام لئے بغیر اقرار کیا گیا ہے کہ عالم مراد ہے ماسواء اللہ تعالیٰ سے اور ماسواء اللہ کی دو قسمیں ہیں قدیم اور حادث۔ قدیم عقول و افلاک اور ان کے نفوس ناطقہ اور کلیات عناصر ہیں۔ اور کہیں صریح طور سے بعض فلاسفہ یونان کا نام لیا گیا اور مفروضہ احادیث سے ان فلاسفہ کے اقوال کی تائید کی گئی مثلاً روح کی قدامت کے سلسلہ میں پہلے افلاطون کا یہ قول پیش کیا گیا کہ نفوس قدیم ہیں پھر اس قول کے بعد اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ افلاطون کا قول حق ہے یہ کسی طرح باطل نہیں ہو سکتا اور آخر میں دو مفروضہ حدیثوں کو یعنی روحوں کے لشکر کے لشکر موجود تھے اور ارواح کو اجساد کی تخلیق سے دو ہزار برس قبل خلق فرمایا گیا مقام استدلال میں پیش کیا گیا۔^۴

خلاصہ یہ ہے کہ شیخ المقتول کا مرکزی نظریہ تو نوافلاطونیت سے ماخوذ تھا، لیکن خود چونکہ نوافلاطونیت مختلف فلسفوں کی آئینہ بردار تھی بنا برائیں شیخ المقتول کے یہاں بھی ارسطو کے علاوہ دوسرے فلاسفہ یونان اور علی الخصوص افلاطون کے افکار جلوہ فرما نظر آتے ہیں۔

۱۔ ”حکمت الاشراق“ مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۴۵۲۔ ۵۲ حوالہ سابق صفحات ۱۹۱ x ۱۸۱ x ۱۴۱۔ ۳۵ ”ہیاکل النور“

مطبوعہ مطبع السعادة مصر۔ صفحات ۱۴-۱۶۔ ۵۳ حوالہ سابق صفحات ۲۸-۲۹۔ ۵۵ ”حکمت الاشراق“ صفحہ ۲۸۹۔

۲۔ ”حکمت الاشراق“ صفحہ ۲۶۹

۳۔ حوالہ سابق۔ صفحہ ۲۸۲

۴۔ حوالہ سابق۔ صفحہ ۱۳۱

۵۔ حکمت الاشراق مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۳۸۲

باب الاستفسار

قصیدہ مومن کے بعض اشعار

(سید حبیب الرحمن - بریلی)

اس سے قبل آپ نے نگار میں مومن کے ایک قصیدہ کے بعض مشکل اشعار کی صراحت فرمائی تھی اور اس قصیدہ کے اکثر مشکل الفاظ کے معنی بھی تحریر فرمائے تھے، لیکن ضرورت تھی کہ اس قصیدہ کے بہر شعر کا مطلب بیان کیا جاتا کیونکہ اس کے بعض اشعار اتنے مشکل ہیں کہ کسی کے سمجھ میں نہیں آتے۔ میں نے متعدد پروفیسروں سے بھی دریافت کیا لیکن ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئے۔ بہر حال یہ جسارت تو میں نہیں کر سکتا کہ قصاید مومن کے تمام مشکل اشعار کی شرح لکھنے کی درخواست آپ سے کروں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ جو اشعار میری سمجھ میں نہ آئیں وہ وقتاً فوقتاً آپ کو لکھتا رہوں اور آپ ذریعہ نگار ان کی تشریح کرتے رہیں۔

فی الحال یہ چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ زحمت نہ ہو تو ان کے معنی سمجھا دیجئے۔

- ۱۔ ذرودہ اوج سے برعبس کو رفعت ہو جائے نور میں زیرہ کرے مہ کے قراں سے انکار
- ۲۔ تاکہ ہو جائے ہر آزار کا مصدر ایک ایک سخت تحسین کو ہے دفع طبیعت پہ قرار
- ۳۔ بندھے امید گر ایک خوشہ گندم کی مجھے مہر تخیل سے ہو برج شرف کے بیزار
- ۴۔ گر حصولِ نذر مسکوک کی سمجھوں میں دلیل ناخن شیر سے سینہ خورشیدِ فگار
- ۵۔ خون کے میرے ارادہ سے ہوا ذابِ سعد قتل پر میرے کمر باندھے ہے شکلِ حبار
- ۶۔ زلیست اپنی ہے تو تزییع و تقابل کے سوا بھول جا دیں گے منجم جو ہیں باقی انظار

(نگار) آپ نے جنے اشعار نقل کئے ہیں وہ سب اصطلاحات نجوم سے متعلق ہیں اور اگر وہ اصطلاحات معلوم ہوں تو پھر ان کا سمجھنا مشکل نہیں۔

مومن نے یہ قصیدہ حضرت عثمان کی منقبت میں لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس میں بکثرت تلمیحات و اصطلاحات نجوم سے کام لیا ہے۔ آپ کے منقولہ اشعار قصیدہ کے اس حصہ سے تعلق رکھتے ہیں جس میں مومن نے اپنی زبوں طالعی کا ذکر کیا ہے اور چونکہ مومن ماہر علم نجوم تھا اور سیاروں کی گردش کے اثرات کا قائل، اس لئے وہ ان اشعار میں اپنی بدبختی کا سبب گردشِ سیارگان ہی کو قرار دیتا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے نجوم کی بعض اصطلاحات استعمال کی ہیں جن سے عام طور پر لوگ ناواقف ہیں۔ اس قصیدہ میں مومن اپنی زبوں طالعی کا بیان اس شعر سے کرتا ہے :-

اے شہ پایہ فزا، مدح سرا گر سرا، پستی بخت نگوں سار سے ہو شکوہ گزار

اور پھر اصطلاحات نجوم میں وہ شکوہ شروع کر دیتا ہے جس کے تمہیدی چند اشعار آپ نے چھوڑ دئے ہیں۔ مثلاً:-
 طالع پست کی نسبت سے مرے دائروں چرخ بخت تیرہ سے مرے روز مہ انور تار
 روز باخوردن اور رات شب یلعا ہے دونوں نقطوں پہ ہے یوں ہمیری لیل و نہار
 میرے اقبال کا آجائے اگر دور قریب تو ثابت سے گراں رد ہوں نجوم سیار
 یہ غالباً آپ کی سمجھ میں آگئے ہوں گے اس لئے آپ نے ان کا ذکر نہیں کیا۔
 آپ کے منقولہ اشعار کا مطلب یہ ہے:-

- ۱- ذرہ (عروج، بلندی) - برجیں (سیارہ مشتری جسے قاضی فلک بھی کہتے ہیں) - رجعت (واپس لوٹ آنا)۔
 ثور (ایک برج کا نام) - قرآن (دو سیاروں کا ایک برج میں اجتماع)۔
 مشتری کا گردش کے انتہائی عروج پر پہنچ جانا اور برج ثور میں زہرہ اور قمر کا اجتماع یا قرآن، بڑی فال نیک سمجھا جاتا ہے
 لیکن مومن کہتا ہے کہ میری بدبختی کا یہ عالم ہے کہ میرے طالع کا مشتری انتہائی عروج پر پہنچ جانے کے بعد بھی فوراً لوٹ جاتا
 ہے اور برج ثور میں زہرہ اور قمر کا قرآن ہوتا ہی نہیں۔
- ۲- نحسین (دو منحوس سیارے زحل اور مریخ) - دفع طبیعت (طبعی یا فطری ترقی کو روکنا)۔
 لفظ سخت کا تعلق نحسین سے نہیں بلکہ قرآن سے ہے یعنی ان دونوں نحس سیاروں نے آپس میں فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مجھے ترقی
 د کرنے دیں گے اور ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ مجھے آزار پہنچائے گا۔
- ۳- قہر (آفتاب) - برج شرف (برج حمل) - تحویل (لوٹنا)
 جب سورج برج حمل کی طرف لوٹتا ہے تو گرمی کا زمانہ شروع ہوتا ہے اور اسی وقت گیہوں پکتا ہے۔
 مومن کہتا ہے کہ اگر مجھے کبھی ایک خوشہ گندم کی امید پیدا ہوتی ہے تو برج حمل میں سورج کی تحویل بھی ختم ہوتی ہے اور نتیجہ
 یہ ہوتا ہے کہ میرا خوشہ گندم نا پختہ رہ جاتا ہے۔
- ۴- شیرے مراد برج اسد ہے۔ اور زہر مسکوک سے اشرافی - مطلب یہ ہے کہ میں ایسا بد بخت ہوں کہ اگر آفتاب کو دیکھ کر
 میں یہ خیال کروں کہ اس طرح کی اشرافی کبھی مجھے مل سکتی ہے تو برج اسد، خود آفتاب کا سینہ زخمی کر دے، تاکہ
 اسے دیکھ کر امید حصول زر کی امید مجھ میں پیدا نہ ہو سکے۔
- ۵- سعد ذابح اور جبار دونوں ستاروں کے اجتماع کی مختلف صورتیں ہیں۔ سعد ذابح ستاروں کی اس شکل کو کہتے ہیں جس سے
 ایک شمشیر بکھرتا ہے یا ذابح (ذبح کرنے والے) کی صورت متصور ہوتی ہے۔ اور جبار میں ایک مسلح سپاہی کی سی۔
 مدعا یہ کہ سعد ذابح کو ذابح اس لئے کہتے ہیں کہ وہ میرے قتل پر آمادہ ہے اور جبار کو جبار اس لئے کہتے ہیں کہ وہ میرے قتل
 پر کمر بستہ ہے۔

- ۶- تربیع (دو ستاروں کے درمیان تین برجوں کا فاصلہ) - تقابل (دو ستاروں کے درمیان چھ برجوں کا فاصلہ)۔
 انظار (جمع ہے نظر کی) - نجومیوں کی اصطلاح میں ستاروں کی رفتار کے رخ کو نظر کہتے ہیں) - نجومیوں کے یہاں سیاروں
 کی وہ نظریں جنہیں تربیع و تقابل کہتے ہیں دونوں نحس ہیں - مومن کہتا ہے کہ میں ایسا ازلی بد نصیب ہوں کہ جب تک
 میری زندگی ہے، نجومیوں کو تربیع و تقابل کی منحوس نظروں کے سوا سیاروں کی کوئی نظر سامنے آئے ہی گی نہیں اور وہ

تمام دوسرے انظار بھول جائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ مومن کے تمام وہ اشعار جو اس قسم کی تعلیمات سے تعلق رکھتے ہیں، مشکل ضرور ہیں اور انھیں مشکل ہونا چاہئے، کیونکہ اس زمانہ میں قصیدہ نگاری اور مشکل نگاری ایک ہی چیز تھی جس کا مقصود اپنی قابلیت اور وسعت معلوم کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن مومن چونکہ طبعی طور پر غزل گو شاعر تھا اس لئے وہ اس مبالغہ آرائی سے گھبرا کر کبھی غزل سرائی تک بھی پہنچ جاتا تھا، چنانچہ اسی قصیدہ میں اس کے یہ اشعار (مطلع ثانی) کے ملاحظہ ہوں:-

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار
چھوڑ دو آج وفا گرہ وفا سے بیزار
آگیا لب پہ دم اور بات نہ پوچھی تم نے
بوسہ دینے کا اسی منہ سے کیا تھا اقرار
گر تمھیں صحبت اغیار سے پرہیز نہیں
ہم بھی کچھ چارہ آزار کریں گے زہار
وہ جلے محفل دشمن میں جو ہو ماہ لفتا
مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار

اور میں مومن کی اسی متغزلانہ انفرادیت کا دلدادہ ہوں۔

ادب و تنقید کی معیاری کتابیں

(چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے)

اردو تنقید پر ایک نظر	(پروفیسر کلیم الدین احمد)۔۔۔ ص	ادب و نظر۔۔۔۔۔ (آل احمد سرور)۔۔۔۔۔ ل
سخنہائے گفتنی	()۔۔۔۔۔ ص	نئے اور پرانے چراغ۔۔۔۔۔ (جدید ادیشن)۔۔۔۔۔ ص
ادب کیا ہے؟	(ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)۔۔۔۔۔ ع	مقدمہ شعر و شاعری حالی۔۔۔۔۔ ع
ادب کا مقصد۔۔۔۔۔	()۔۔۔۔۔ ع	ادبی تنقید۔۔۔۔۔ (ڈاکٹر محمد حسن)۔۔۔۔۔ ل
اردو ادب میں تنقید۔۔۔۔۔	(ڈاکٹر احسن فاروقی)۔۔۔۔۔ ع	مطالعہ حالی۔۔۔۔۔ (ناظر کاکوروی و شجاعت علی)۔۔۔۔۔ ل
قدر و نظر۔۔۔۔۔	(اختر انیسوی)۔۔۔۔۔ ل	مطالعہ شبلی۔۔۔۔۔ ()۔۔۔۔۔ ل
نقش حالی، حصہ اول۔۔۔۔۔	ص	اکبر نامہ۔۔۔۔۔ (عبدالماجد دریا بادی)۔۔۔۔۔ ع
نقش حالی، حصہ دوم۔۔۔۔۔	ع	امراؤ جان ادا۔۔۔۔۔ (مرزا رسوا)۔۔۔۔۔ ع
نقوش افکار۔۔۔۔۔	(مجنوں گورکھپوری)۔۔۔۔۔ ع	طلمس اسرار۔۔۔۔۔ ()۔۔۔۔۔ ع
ذوق ادب و شعور۔۔۔۔۔	(احتشام حسنین)۔۔۔۔۔ ع	فلسفہ اقبال۔۔۔۔۔ (جدید ادیشن)۔۔۔۔۔ ع
روایت اور بغاوت۔۔۔۔۔	()۔۔۔۔۔ ل	بہار میں اردو زبان کا ارتقاء۔۔۔۔۔ (اختر انیسوی)۔۔۔۔۔ ع
تنقیدی جائزے۔۔۔۔۔	()۔۔۔۔۔ ع	آتش گل۔۔۔۔۔ (جگر مراد آبادی)۔۔۔۔۔ ص
تنقیدی نظریات۔۔۔۔۔	()۔۔۔۔۔ ص	ادبی خطوط غالب۔۔۔۔۔ (مرزا عسکری)۔۔۔۔۔ ل
تنقیدی اشارے	(آل احمد سرور)۔۔۔۔۔ ع	

نمیجر نگار لکھنؤ

دعوتِ فکر و نظر

تاب جاں بخشی بے صرفہ ستم لاتا کون
وہ تو یوں کہے مجھے فکرِ مداوا ہی نہیں

جولائی کے شمار میں اربابِ سخن سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ مندرجہ بالا شعر پر اظہارِ خیال فرمائیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد خطوط مختلف طبقہ کے شعراء کی طرف سے موصول ہوئے۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی محض ترکیبِ الفاظ کی وجہ سے شعر کا مطلب سمجھنا کتنا دشوار ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بعض کے نزدیک شعر لغو و جہل قرار پاتا ہے اور بعض کے نزدیک بہت بلند و پاکیزہ! فی الحال چند اہم خطوط پیش کئے جاتے ہیں جس کے مطالعہ کے بعد ایک نیا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ بے صرفہ کا صحیح مفہوم کیا ہے، ممکن ہے یہ لفظ محتمل الضدین ہو، یعنی اس کے معنی عبت، بے سود بھی ہوں اور حد سے زیادہ بھی۔ اس نے ضرورت ہے کہ اکابرِ شعراء کے کلام میں اس کے محل استعمال پر غور کیا جائے۔ بہر حال میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے چند خطوط یہاں پیش کرتا ہوں۔

(نیاز)

(جناب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

پہلے الفاظ کے معنی لیجئے :-

تاب = برداشت کی طاقت۔

جاں بخشی = ایسے جرم یا خطا کا عفو جس کی سزا موت ہو۔

بے صرفہ ستم = ایسا ستم جس کی حد و نہایت نہ ہو اور جبری بیدردی و بے باکی سے توڑا جائے اور باقی بیداد کو مطلق رحم نہ آئے۔

لاتا کون = کوئی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

لہذا پہلے مصرع کا یہ مطلب ہوا کہ ایسا ستم برداشت کرنا مشکل تھا جو بے پایاں ہے، تاہم جان لبوا نہیں بلکہ مشقِ ستم جاری رکھنے کے لئے ہر مرتبہ ترپتا، سسکتا، بلکتا، آدھ مو اچھوڑ دیتا ہے۔

دوسرے مصرع کا مطلب :- مجھے ایسے ستم کا تختہ مشق رہنا گوارا ہے اور فکرِ درماں سے بے نیاز ہوں (کیونکہ لذتِ درد کو

درمان درد پر ترجیح دیتا ہوں جو عاشقوں کی شان ہے)۔

شعر میں ”تاب جاں بخشی بے صرفہ ستم“ کی باطنی ترکیب کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ ایک وسیع خیال ایک بدیع اسلوب سے

چند الفاظ میں ادا ہو گیا۔ ستم ہے اور حد کا ستم ہے، تاہم موجبِ ہلاکت نہیں بلکہ جاں بخشی ہے مگر یہ جاں بخشی ہر ستم کے ترجم نہیں

بلکہ مشق ستم جاری رکھنے کے لئے ہے۔ عاشق کو معشوق کی یہ ادائے ناز اس لئے پسند ہے اور دل میں کھپ گئی ہے کہ لذت درد کو درمان درد سے بہتر سمجھتا ہے۔

تاہم میری نکتہ چیں طبیعت کہتی ہے کہ تکمیل شعری میں ایک آئینہ کی کسر رہ گئی۔ پہلے مصرع میں "لاتا کون" سے "کیا لاتا" کہیں بہتر ہوتا۔ "لاتا کون" میں تعمیم ہے۔ "کیا لاتا" میں تخصیص ہے۔ قائل شعر دوسروں سے خالی الذہن ہو کر اپنا حال بیان کر رہا ہے لہذا کہے گا کہ میں تاب کیا لاتا نہ کہ کون تاب لاتا۔

دوسرے مصرع میں "وہ تو یوں کہے" صحت زبان و لطافت بیان دونوں کے خلاف ہے۔ میری ناقص رائے میں مصرع کی یہ صورت بہتر ہوتی :- "وہ تو کہے کہ مجھے فکر مداوا ہی نہیں" - ترمیم کے بعد شعر اس طرح ہوگا :-

تاب جاں بخشی بے صرفہ ستم کیا لاتا وہ تو کہے کہ مجھے فکر مداوا ہی نہیں
اصل شعر سے موازنہ کے بعد فیصلہ کیجئے۔

"اڑتی ہوئی خبر ہے زبانی طیور کی" کہ جب میر "صاحب قبلہ" نے زیر نظر شعر عالم تمثال میں سنا تو ایک ٹھنڈی سانس بھری اور زیر لب فرمایا :-

"ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے حسن کو بے صرفہ، نے عشق کو محابا" (میر)

(سعادت نظیر)

پہلے مصرع کی نشریوں ہوگی کہ بے صرفہ ستم کی جاں بخشی کی کون تاب لاتا ؟ اگر بے صرفہ ستم کی ترکیب بدل دیں تو ستم بے صرفہ ہوگا اور نشریوں ہوگی ستم بے صرفہ کی جاں بخشی کی کون تاب لاتا ؟۔

"وہ تو یوں کہے مجھے فکر مداوا ہی نہیں" سے واضح ہوتا ہے کہ مجھے فکر مداوا ہی نہیں اس لئے میں ستم بے صرفہ کی جاں بخشی کی تاب لاتا ہوں۔ یہ تو ہوئی میری دانست میں شعر کی نشر اور یہی معنی کی بات سو جس طرح ستم بے صرفہ کی جاں بخشی بے معنی ہے، جاں بخشی کی تاب لانا بھی اس سے کم بے معنی نہیں۔

پورے شعر کی نشریوں ہوئی، "اگر مجھے فکر مداوا ہوتا تو میں ستم بے صرفہ کی جاں بخشی کی تاب نہ لاتا" جس سے کوئی معنی مفید متبادر نہیں ہوتے۔

اگر تاب کو ستم سے متعلق کر کے بے صرفہ کا الحاق جاں بخشی سے کریں تو معنی یہ ہوں گے کہ بے صرفہ جاں بخشی کے ستم کی کون تاب لاتا گویا ان کی بے صرفہ جاں بخشی ایک ستم ہے، مجھے فکر مداوا ہوتی تو میں اس ستم کی تاب نہ لاتا مگر اس کا بھی کوئی اصولی امکان شعر باب البحث میں نہیں پا جاتا۔

(کاشف الہاشمی - آجین)

مفہوم شعر الفاظ شعر سے متبادر ہے۔ مگر پر شکوہ الفاظ نے شعر کو الجھا دیا ہے۔
دوسرا مصرع اگر "وہ تو کہے کہ مجھے فکر مداوا ہی نہیں" ہوتا تو بہتر تھا۔ مگر مضمون اتنا پیارا اور خیال اتنا بلند ہے کہ عجیب

شعر کے حسن کو غارت نہیں کرتا۔ بحیثیت مجموعی شعر نہایت پاکیزہ، معیاری اور بامعنی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ شاعر کے علوئے فکر، اور خلوص یقین کا ترجمان ہے۔ بنیادی خیال یہ ہے کہ: شاعر زندگی کو ایک ایسے ستم کا نتیجہ سمجھ رہا ہے جو بے فائدہ اور ناقابلِ برداشت ہے۔ مگر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ عالمگیر قانونِ حیات کی رو سے وہ زندہ رہنے پر مجبور ہے تو اپنی مجبوری پر وہ عالی ظرفی بلند حوصلگی اور ضبط و تحمل کا پردہ ڈالتے ہوئے اپنی بے نیازی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

بے فائدہ ستم کے بدولت ملی ہوئی زندگی کا گوارا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں اور کوئی متنفس ایسا نہیں جو اسے برداشت کر سکے مگر میں اس کو محسوس ہی نہیں کرتا اور اس تکلیف سے نجات پانے کی تدبیر کی فکر ہی نہیں کرتا۔

(فضا کو شری)

جریدہ ”نگار“ جولائی ۱۹۶۷ء میں ”دعوتِ فکر و نظر“ کے عنوان سے جو شعر شائع ہوا ہے۔ اس کے اندر مجھے تو کوئی خوبی نظر نہیں آئی لفظوں کا ڈھکوسلا ہے۔

”تاب“ کا تعلق ”لاتا“ سے بھدے قسم کی تعقید لفظی ہے، مگر یہ اس زمانہ کا شعر معلوم ہوتا ہے جب اس پر اتنی گرفت نہیں ہوتی تھی، معنوی اعتبار سے شعر عہد موجودہ کی نظر میں قابلِ داد و ستایش نہیں مگر اس وقت رہا ہو۔

شاعر کہتا ہے کہ میں نے فکر مدا و اچھوڑ دی ہے اس لئے تاب لا رہا ہوں معشوق کے ایسے ستم کی جو جاں بخشی کے پردے میں بے پروائی کے ساتھ کیا جا رہا ہے اگر میں ایسا نہ کرتا تو اور کون مرد افکن عشق تھا جو ایسے ستم کی تاب لاتا جو بڑی بے پروائی کے ساتھ جاں بخشی کے تحت کیا جا رہا ہے۔ بے صرفہ کے معنی بے پروائی اور بے خیالی ہے، صرفہ کے معنی خیال اور پروا۔ جیسا کہ شاہ ظفر دہلی نے کہا تھا:۔

صرفہ نہیں کاغذ کا مگر بھیجتے ہیں وہ خط ڈاک میں اندیشہٴ محصل سے ہلکا

(پروفیسر سید عظمت اللہ سرحدی - مدراس)

شعر کا بنیادی فقرہ ”بے صرفہ ستم“ ہے۔ معنی یہ ہیں:۔ ”مریضِ عشق کو فکر مدا و انہیں اس لئے وہ کسی کی جاں بخشی کی تاب نہیں لاسکتا۔ ستم کی انتہا جان لیوا ہوتی ہے اور اس میں جتنی کمی ہوگی اس حد تک گویا عاشق کی جاں بخشی ہے۔ ستم کی کمی کی وجہ سے جو جاں بخشی ہوئی ہے وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ جسے فکر مدا و ابھی نہیں وہ اس جاں بخشی کی تاب کیا لائے۔ شاعر کی تمنا ہے کہ معشوق ستم ڈھانے میں کوئی کسر اٹھانے رکھے یہاں تک کہ مریضِ عشق کا خاتمہ ہو جائے۔“

جامعیت اور معنویت کے لحاظ سے یہ شعر بہت اونچا ہے۔ فقط والسلام

(سحر عشق آبادی)

شاعر کہنا چاہتا تھا کہ:۔

وہ تو یوں کہتے (یعنی خیر گزری) مجھے فکر مدا و ابھی نہیں (دورنہ) ستم نے جاں بخشی کی تاب کون لاتا یعنی میں فکر مدا و کرتا اور معشوق کے ستم سے نجات چاہتا اور وہ میری جان پر ظلم کرنا چھوڑ دیتا تو مجھے اس طرح ترک تعلق گوارا نہ تھا کیونکہ حلف ہو یا ستم اس سے ایک تعلق تو رہتا ہے۔

شعر کے الفاظ شاعر کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کافی نہیں لفظ بے صرفہ ظلم صرف اور بار شعر ہے اور ایک صاف کی کمی بھی ہے۔ ”تاب جاں بخشی ستم“۔

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا
اونی
گیبڑین
سوٹنگ
شال
سرچ
پانامہ
پریشیا

کپڑا
سلکی پرنٹس
فرنج کوٹین
چھوکرہ کوٹین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لینن
شنٹون

کپڑا
سلکی پلین
جورجٹ
بجرج
کریپ
ساٹن
ٹفاٹ
بشرت کلاتہ
شنٹون
نائلن
ننون

ان کے علاوہ عمدہ نفیس سوئی چیمینٹ اور اونی دھاگہ۔

تیار کردہ

دی امرتسرین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ بی۔ ٹی روڈ امرتسر

تارکاپتہ : رین (Rayon)

ٹیلیفون 2562

سٹاکسٹ = ٹراونکوریٹ رین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

بہر رنگے کہ خواہی...

(دانش فرازی)

نشہ بادہ صاحب نظراں تیرا جمال
اہمتر از نفس نغمہ گراں تیرا جمال
جشن خوں باری شوریدہ سراں تیرا جمال
تجھ سے روشن مرے محراب تخیل کے چراغ
چاک، سیراہن گل میں، دل مہتاب میں داغ
ورق لالہ و گل میں ترے رخ کی جدول
سر آفاق شفق رنگ وہ تیرا آئینہ
کہیں گیسو کے وہ منہل، کہیں عارض کے کنول
آئینہ دار سحر تیرے تبسم کی بہار
لب جاں بخش کی جنبش سے شعاعوں کی پھوار
جلوہ آرائے جہان گزراں تیرا خرام
خیمہ ابر ہو یا سایہ گل، تیرا مقام
نغمہ جوئے سبک سیر میں تیرا پیغام
کبھی منت کش الفاظ نہ تھاروئے سخن
شاہد معنی فطرت کو رہی تیری لگن
تجھ کو تیری ہی نظر سے کبھی دیکھا میں نے
تجھ کو ہر جامہ صد رنگ میں پایا میں نے
اپنی آنکھوں سے لگایا قد رعنا میں نے
تو میرے پیش نظر تھا، تیری تصویر نہ تھی
ہائے وہ وقت کہ جب پاؤں میں زنجیر نہ تھی
اب نہیں فکر گراں باری اسباب الم
حسرتِ قربت و محرومی دیدار کا غم
بے نیازِ خلش شوق ہے دل کا عالم
اب تیرے عہد وفا کا بھی کوئی پاس نہیں
تو میری راحت جاں تھا مجھے احساس نہیں

چراغِ کشتہ

(فضا ابن فیضی)

مڑکا مڑکا سا نفس ہے چین میں لالے کا
 لہو سے تر ہے جبین، زہرہ و شریا کی
 جہاں فضاؤں سے صہبائے زندگی برسے
 جنوں نے دی ہے نئے حادثوں کو پھر آواز
 وہی سفینہ عہد رواں وہی دھارے
 وہی ہوس وہی جرم و گناہ کے سیلاب
 پلٹ کے ایک نظر بھی نہ دیکھا دنیا نے
 نظر تمام جبراحت، نفس تمام خراش
 وہی خیال کی تربت وہی خرد کے مزار
 وہی ہے ناخن تہذیب کی جگر کا وی
 جبین پہ مکر و ریا کے دئے جلائے ہوئے
 اس انقلاب پہ حیراں ہیں منبر و محراب
 وہی فضا ہے وہی نفرتوں کی گلکاری
 وہی جنوں ہے وہی چاک آستینوں کے
 یہ ریگ زارِ حوادث یہ موت کے جنگل
 گزر گئی جو ستاروں پہ رات کیا جانے
 نگاہ و فکر کے سورج حکم رہے ہیں مگر
 شکار کھیل رہی ہے سحر اُجالے کا
 کہاں "قیامت کبریٰ" جنوں نے برپا کی
 چین کی روح وہاں ایک پھول کو ترسے
 وہ پھر ہوا ہے درِ کفر کم نگاہی باز،
 وہی زمین وہی زلزلوں کے گہوارے
 یقین و کفر کے تاروں کو چھیڑتی مضرب
 کراہتے رہے کھا کھا کے چوٹ دیوانے
 یہ کائنات ہے یا کوئی چلتی پھرتی لاش
 وہی نگاہ کا ماتم وہی دلوں کا فشار
 وہی تمدن وحشی ہے ملک پر حاوی
 شگوفے کو یا شراروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے
 کہ جامِ شیخ میں ہے کن صنم کدوں کی شراب
 وہی ہے عقل و سیاست کی گرم بازاری
 غبار و ہل نہ سکیں کے ابھی جبینوں کے
 نچوڑتے ہیں لہو آستین سے بادل
 چلا ہوں اپنے اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے
 شبوں کی مہر ابھی ثبت ہے سویروں پر

نظر میں ظلمت ماحول کا بسیرا ہے
 جہاں چراغ ہیں روشن وہیں اندھیرا ہے

غزلیات

(شفقت کاظمی)

کبھی جو تذکرہ اہل غم چلا ہوگا۔ تری زباں پہ مرا نام آگیا ہوگا
 رہیں گے فکر دو عالم سے بے نیاز وہی بقید ظن ترا غم جنہیں ملا ہوگا
 شکایت اُن کے تغافل کی بعد میں ہوگی ابھی تو شکوہ تقدیر نار سا ہوگا
 ترے فراق میں گزرا جو حادثہ ہم پر زبان خلق سے تو نے بھی سن لیا ہوگا

حضور دوست اشاروں میں بات کیا شفقت

بیان حال جو ہوگا سو بر ملا ہوگا

آج حیراں ہیں یوں آپ سے مل کے ہم جیسے اب تک نہ تھے آشنا آپ سے
 ہم نے جو بات ظاہر نہ کی آپ پر لوگ کہتے رہے بر ملا آپ سے

(شفا گو الیاری)

راہوں کا نشان یاد نہ منزل کا پتا یاد وارفتگی شوق میں کچھ بھی نہ رہا یاد
 تلواریں سی جلتی ہیں سیروں کے دلوں پر زنداں میں جب آتی ہے گلستاں کی ہوا یاد
 اے دوست کلیجہ مرا آجاتا ہے منہ کو لقمہ نہ گزری ہوئی باتوں کی دلا یاد !
 اے دوست تری محویت یاد میں مجھ پر ایسی بھی گھڑی آئی کہ تو بھی نہ رہا یاد

(میتن نیازی)

آغاز وفا کا وہ عالم، وہ پہلی نظر، وہ حسنِ کرم وہ دور نہ آیا لوٹ کے پھر، وہ کیف میسر ہو نہ سکا
 نہ آسودہ مسرت سے نہ غم سے دلِ ناداں تری منزل کہاں ہے
 سر منزل اکیلے ہم نہیں ہیں ہمارے ساتھ سارا کارواں ہے
 اسی کو کہتے ہیں اہل نظر شباب اے دوست یہ اضطراب مسلسل، یہ پیچ و تاب اے دوست
 کہا تھا کس نے کہ پھر وعدہ وفا کرے بڑھا دیا ہے بہت تو نے اضطراب اے دوست
 اتنا مجبور نہ آئین وفا سے ہو کوئی، داستانِ غم پیہم بھی سنائے نہ بنے
 پردہ دارِ محبت بھی عجب شے ہے میتن
 بات کہتے نہ بنے، بات چھپائے نہ بنے

(جاوید حیدر آبادی)

عشق کی بنیاد ہی پر ہے بنائے زندگی عشق بھی اک زندگی ہے ماورائے زندگی
 ہر نفس بارگراں ہے ہر قدم دشوار تر آپ کی دوری میں کیونکر اس آئے زندگی

(غنی احمد غنی)

غم حبیب مجھے راس آگیا، ورنہ حیات کیسے گزرتی غم حیات کے بعد
یہی تو ایک سہارا حیات شوق کا تھا میں کیا کروں گاترے درد سے نجات کے بعد
کرم سے اپنے گرانبار اس قدر بھی نہ کر کہ سر اٹھانے سکوں تیرے التفات کے بعد

(سعادت نظیر)

اُن کی موجیں ہیں اُن کا دریا ہے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں جو ساحل سے
زندگی اُس کی زندگی ہے، نظیر جس کو نسبت ہو اُن کی محفل سے
ہے چین میں آج کل دور خزاں ہم کہاں دل اپنا بہلانے چلے
زلف دوراں کیسے جاتاں نہیں کس کو سلجھانے یہ دیوانے چلے؟

(اکرم دھولیوی)

ہر اک خوشی خیال ہے، ہر اک امید خواب ہے ترے بغیر زندگی خراب تھی، خراب ہے
یہ درد و غم ہے مستقل، عبت میں آپ منفصل کہا نہیں کہ حالِ دل ازل ہی سے خراب ہے

ترجمہ رباعیات ختام

(طالب جے پوری)

دنیا سے امید لطف و احساں بیکار دنیا سے فکر سرد سماں بیکار
درد طلبی درد بڑھا دیتی ہے دل درد کا خوگر ہو تو درماں بیکار

یارب! یہ کرمی کہ ستم ہے تیرا عاصی کے لئے نہیں ارم ہے تیرا
بخشا جو اطاعت پہ تو کیا بات ہوئی بختے جو گنہ پر تو کرم ہے تیرا

ناداں سے کبھی دل نہ لگنا طالب نا اہل کو محرم نہ بنانا طالب
گراں نہ ہو کوئی تو کسی اور سے کیا ممکن ہو تو خود سے بھی چھپانا طالب

مطبوعات موصولہ

دیہاتی معالج یہ کتاب دو جلدوں میں ہمدرد (وقف) لیبریریٹریز دہلی نے اس مقصد کے ساتھ شائع کی ہے کہ دیہات کے رہنے والے جو شہری ذرائع علاج سے محروم ہیں، خود دیہات ہی میں میسر آنے والی اشیاء اور جڑی بوٹیوں سے حادثات و امراض کا مقابلہ کر سکیں۔

اس میں اسباب امراض اور احتیاطی تدابیر کی بھی صراحت کر دی گئی ہے تاکہ دیہات کے رہنے والے بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ہمدرد دو خانہ نے یہ کتاب شائع کر کے ملک کی بڑی عظیم خدمت انجام دی ہے اور ضرورت ہے کہ یہ کتاب ہر گھر میں ہر وقت سامنے ہے اور بار بار اس کا مطالعہ کیا جائے، علاوہ اسکے یہ بھی ضروری ہے کہ تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ کر کے سارے ملک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے تو اس کا افادہ اور زیادہ عام ہو جائے گا۔

کتاب تمام ضروری نقوش و تصاویر کے ساتھ نہایت نفیس کاغذ پر بہترین طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور یہ دونوں جلدیں جو ۵۵۰ صفحات کو محیط ہیں پانچ روپیہ آٹھ آنے میں ہمدرد لیبریریٹریز دہلی سے مل سکتی ہیں۔

اردوئے معلیٰ رسالہ ہے اردو کا جو دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے سال میں دو بار شائع ہوگا۔ پہلا شمارہ (غالب نمبر) شائع ہو چکا ہے اور دوسرا زیر ترتیب ہے۔

اس رسالہ کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو کے صدر) ہیں اور ان کے اکثر نقاد کار بھی اسی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اب سے دو سال قبل دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا کوئی وجود نہ تھا بلکہ اس کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہ آسکتا تھا، لیکن یہ محض ڈاکٹر فاروقی کی غیر معمولی کوششوں کا اعجاز تھا کہ وہاں شعبہ اردو بھی قائم ہو گیا، اس کے لئے ایک معقول گرانٹ بھی منظور ہو گئی، ایک شعبہ قدیم مخطوطات کی نشر و اشاعت کا بھی قایم ہو گیا اور اسی کے ساتھ ایک بلند پایہ جریدہ کی بنیاد بھی پڑ گئی۔

ڈاکٹر فاروقی اس وقت قدراول کے ادیبوں و نقادوں میں بھی ایک خاص امتیاز کے حامل ہیں اور متعدد ادبی و تنقیدی کتابوں کے مصنف۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا سب سے بڑا انتقادی کارنامہ جو بجائے خود ایک ادبی شاہکار بھی ہے، میر سے تعلق رکھتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ہر تصنیف اور ان کا ہر مقالہ نو شین ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتنی خوشی کی بات ہے کہ یہ رسالہ انھیں کی نگرانی و ادارت میں شائع ہو رہا ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ زبان کی بڑی گرفتار خدمات انجام دے گا۔

پہلی اشاعت میں غالب کے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ نہ صرف اہم و دلچسپ ہیں بلکہ ان میں سے بعض نئی بھی ہیں۔ جناب ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تالیف ہے، جس میں انھوں نے عہد امیر خسرو سے لے کر عہد حاضر تک کی تمام ان نظموں کو یکجا کر دیا ہے جو ہندوؤں کے تہواروں سے تعلق رکھتی ہیں۔

کعبہ میں صنم خانہ ان تہواروں میں بسنت، ہولی، دیوالی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور انھیں پر اکثر شعراء نے اظہار خیال کیا ہے اور ایسے لب و لہجہ میں جو یکسر خلوص و صداقت کا مظہر ہے۔

اس وقت جبکہ ہندوستان میں ہندو مسلم تعلقات کو بہت زیادہ خوشگوار و پایدار بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ مجموعہ سیاسی اہمیت بھی رکھتا ہے اور ملک کو فاضل مولف کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اردو ادب کے سرمایہ سے کچھ ایسی چیزیں بھی ڈھونڈ نکالیں، جو ہندوستان کی مشترکہ قومیت کی تعمیر کے خیال کو زیادہ مستحکم کر دینے والی ہے۔

یہ کتاب ۲۰۸ صفحات کو محیط ہے اور تین روپیہ میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

ادب کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تالیف ہے جس میں انھوں نے پڑسن کی ایک مشہور کتاب کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ ادب و اصناف ادب کا مطالعہ کرنے کے کیا اصول ہیں اور ان کو سمجھنے اور پرکھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر اردو میں یہ سب سے پہلی معقول کتاب ہے جس میں باوجود ایجاز کے کام کی کوئی بات ترک نہیں کی گئی۔

اردو میں انتقادی لٹریچر بہت کچھ فراہم ہو گیا ہے لیکن ”نقد الانقاد“ کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے، یہ کتاب اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے اور ضرورت ہے کہ ہر اہل و نا اہل نقاد اس کا مطالعہ کرے۔

اس کے مطالعہ سے ہم نہ صرف مختلف اصناف ادب کی خصوصیات سے واقف ہو سکتے ہیں بلکہ ان نقادوں کے کارناموں پر بھی نقد کر سکتے ہیں، جو لکھتے زیادہ ہیں اور سمجھتے کم ہیں۔

یہ کتاب تین روپیہ میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

سوز و ساز مختصر سا انتخاب ہے جناب فاروق بانسپاری کی نظموں کا جسے انجمن تعمیر ادب بنارس نے شائع کیا ہے۔

جناب فاروق ملک کے ان چند مخصوص شعراء میں سے ہیں جن کو دُنیا نے کم سچا پنا، حالانکہ وہ بہت زیادہ پہچانے جانے کے قابل تھے۔

جناب فاروق ضلع بلیا کے ایک گاؤں ”بانس پارہ“ میں پیدا ہوئے (۱۹۰۷ء) اور وہیں سے آپ کی شاعری کا آغاز ہوا۔

سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں اخبار مدینہ نے آپ کا تعارف ملک سے کرایا، لیکن اخباری تعارف کی طرف لوگ کم توجہ کرتے ہیں اس لئے جناب فاروق کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہ ہو سکا۔

فاروق صاحب اقبال سے بہت متاثر ہیں اور انھوں نے اس وقت تک جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق اسی انداز کے اصلاحی، اخلاقی و مذہبی مباحث سے ہے جو اقبال کے یہاں ہم کو نظر آتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کو کہیں ہاتھ سے جلنے نہیں دیا۔

اس انتخاب میں ان کی ۳۳ نظمیں شامل ہیں اور ان میں سے ہر نظم اپنی جگہ ایک مستقل ہے اعتبار و بصیرت کا نہایت چمکے تلے الفاظ میں نظم گو شعراء میں، ایسا صحیح سوچنے والا اور صحیح کہنے والا شاعر اس وقت مجھے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ہمیں شکر یہ ادا کرنا چاہئے انجمن تعمیر ادب بنارس کا جس نے ایسے جوہر قابل کو دُنیا سے روشناس کرایا۔

حد و خال مجموعہ ہے جناب اختر رندوانی کی رباعیوں کا۔ جناب اختر ان چند ہندو شعراء میں ہیں جنھوں نے ہمیشہ اردو ہی میں شاعری کی اور بڑے جوش و ولولہ کے ساتھ کی۔ اردو شاعری میں رباعی کی صنف بڑی مشکل صنف ہے اور اس میں فکر کرنا آسان نہیں۔ لیکن اختر رندوانی چونکہ بڑے حساس و کہنہ مشوق شاعر ہیں، اس لئے ان کی رباعیاں جذبات و فن دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہیں۔ یہ مجموعہ جناب اختر رندوانی سے باندھ کر کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء شہید کی تحریک آزادی جسے ”بغاوت ہند“ کہا جاتا ہے، کتنی زبردست واہم تحریک تھی اس کا صحیح علم آزادی ہند سے قبل بہت کم لوگوں کو تھا اور عوام تو اس سے بالکل ناواقف تھے

کیونکہ انگریزی حکومت کے خون سے اس کی صحیح تاریخ لکھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی، لیکن آزادی ہند کے بعد متعدد کتابیں اس موضوع پر شائع ہوئیں اور اس کا سلسلہ جاری ہے۔

اس عہد کی تاریخ لکھنے والوں میں مولانا امداد صابری بھی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ایک کتاب ”شعراء کے غدار شعراء“ کے نام سے مرتب کی اور اب اس کا دوسرا حصہ ”شعراء کے مجاہد شعراء“ کے نام سے شائع کیا ہے۔

مولانا موصوف کو تحقیق و تفحص کا خاص سلیقہ حاصل ہے اور اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کی ترتیب میں کتنی کاوش، کتنی جانکاحی اور کس خلوص و صداقت سے کام لیا ہے۔

یہ کتاب صرف مجاہد شعراء کا تذکرہ نہیں بلکہ ”شعراء“ کی تحریک آزادی کی ایک مستند تاریخ بھی ہے جس سے اس زمانہ کے ماحول اور عوامل و واقعات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں یہ تالیف تاریخ و تذکرہ کے سلسلہ کی بڑی اہم تالیف ہے اور ہمیں امید ہے کہ ملک اس سے مستفید ہوگا۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات، قیمت سات روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی۔

جگر بریلوی انجمن ترقی اردو علیگڑھ نے دور حاضر کے قابل ذکر شعراء کے انتخاب کلام کا سلسلہ شروع کیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ وہ حضرات جو کسی شاعر کا پورا کلام نہیں دیکھ سکتے وہ اس انتخابی سلسلہ سے فائدہ اٹھائیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کتاب یہ بھی ہے جس میں شام موہن لال جگر بریلوی کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

جگر بریلوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے اور غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ بہت معروف و مقبول ہیں۔ وہ کلاسیکل رنگ کے شاعر ہیں اور بہت شایستہ، صاف ستھرے ذوق کے۔ وہ ان چند شاعروں میں سے ہیں، جو محض شاعر نہیں بلکہ انسان بھی ہیں اور ان کی یہ خصوصیت ان کے کلام سے ہر جگہ ظاہر ہوتی ہے۔

زیادہ مناسب ہو اگر اس سلسلہ میں غزلوں کے انتخاب کی جگہ منتخب اشعار شائع کئے جائیں۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات، قیمت بارہ آنے۔

فنون لطیفہ اور جمالیات مجموعہ ہے جناب محمد مظفر حسین صاحب بہاری کے سات مقالوں کا جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھے اور ادبی مجالس میں سنائے۔ ان مقالوں میں فن و فنکار، فن کی تخلیق و تعمیر، اسکی ہمیشہ اقدار اور نظریہ جمالیات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اخیر میں ایک مقالہ جدید آرٹ کے رجحانات پر بھی نظر آتا ہے۔

آرٹ پر جو تنقیدی مقالات لکھے جائیں، ان کا حسن یہ ہے کہ وہ خود بھی آرٹ کا نمونہ ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس خصوصیت کے لحاظ سے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے ایک ایسے ادیب و فنکار کی جس کو لوگوں نے کم جانا، محض اس لئے کہ وہ نہ خود سامنے آئے اور نہ کوئی دوسرا انھیں سامنے لایا۔

ان مقالوں کا اندازہ بیان حد درجہ شگفتہ و دلچسپ ہے اور غالباً اس لئے کہ وہ سب ”انشائیہ“ (Essay) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ کتاب انتقادی لٹریچر میں بڑا مفید و دلچسپ اضافہ ہے اور ضرورت ہے کہ نہ صرف ہماری ادیب و انشایہ دار بلکہ ہمارے نقاد بھی اس کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ فن نقد کو بھی کتنا دلچسپ بنایا جاسکتا ہے، اگر اسے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا جائے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے، ضخامت ۵۰۰ صفحات، ملنے کا پتہ: ضیا پبلشنگ ہاؤس، مقبرہ جناب عالیہ گولہ گنج، لکھنؤ۔

علم بلاغت و عروض ڈاکٹر یونیورسٹی کے نصاب میں علم بیان و عروض کے بھی کچھ حصے شامل ہیں اور انھیں کی تشریح و

وضاحت اس کتاب کا مقصد ہے۔ اسے مولف پروفیسر ظہیر صدیقی مشہور ادیب و نقاد ہیں اور

انھوں نے نہایت جامعیت کے ساتھ ان فنون کی اصطلاحات کو مثالیں دے دیکر سمجھایا ہے۔

قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: پاک کتاب گھر ڈھاکہ

مادرِ وطن کے فلاح و بہبود کے لئے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس، ہموار اور پختہ رنگ ادنی و یونگ یارن

اور

ہینڈ ٹنگ وول (اؤن)

جدید ترین طریقے سے طیارے جاتے ہیں۔

گوگل چندر تن وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ (انکارپوریٹڈ ان بھارت)

کوئٹہ روڈ امرتسر

نیا ادبی لٹریچر

اردو عربی ڈکشنری	عبد الحفیظ بلیادی	۱۰۰
شعروادب - تنقیدی مقالات	سید اختر علی تھری	۱۰۰
تنقیدی شعور	" " " " " "	۱۰۰
اردو ڈراما اور ایڈج	پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱۰۰
آب حیات کا تنقیدی مطالعہ	" " " " " "	۱۰۰
رزم نامہ انیس	" " " " " "	۱۰۰
روح انیس	" " " " " "	۱۰۰
تذکرہ نادر معنفہ کتب من	آدر شاگرد آسج مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱۰۰
فسانہ عبرت معنفہ جب علی بیگ سرور	" " " " " "	۱۰۰
فرہنگ امثال	" " " " " "	۱۰۰
بیگمات اودھ	تصدق حسین	۱۰۰
نیمبر نگار لکھنؤ		
ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	سید احتشام حسین	۱۰۰
ساحل اور سمندر (سفر نامہ)	" " " " " "	۱۰۰
چھان بین - تنقیدی مقالات	اثر لکھنوی	۱۰۰
گدڑ شہنشاہ	یعنی صبح تجلی - چراغ کعبہ - محسن کاکوروی	۱۱۲
تنقیدی مطالعے	اولیں احمد ادیب	۱۰۰
تعبیر - تشریح - تنقید	پروفیسر مسیح الزماں	۱۰۰
اردو ادب میں زمانوی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن	۱۰۰
حرفِ تمنا - مجموعہ کلام	میکش اکبر آبادی	۱۰۰
آتش گل	جگر مراد آبادی	۱۰۰
ناول کی تاریخ اور تنقید	علی عباس حسینی	۱۰۰
ناول کیا ہے؟	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ڈاکٹر محمد حسن فاروقی	۱۰۰
(چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے)		

امینہ اصلاح جناب جوش ملیح آبادی نے اپنے شاگردوں کے کلام پر جو اصلاحیں دی ہیں ان کو کجا کر کے اس نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ جناب جوش ملیح آبادی بڑے کہنہ مشق و کثیر الکلام شاعر ہیں اور اصلاح کلام کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں بعض اصلاحوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فنی و معنوی دونوں حیثیتوں سے ان کی نگاہ کتنی دور رس ہے۔ ”سخنہائے گفتنی“ کے عنوان سے جو بسیط مضمون انھوں نے آغاز کتاب میں دیا ہے، وہ جان ہے اس مجموعہ کی جس میں فاضل شاعر نے شاعری کے نکات و غوامض بیان کر کے نہ صرف نو مشق شعراء بلکہ ادبی نقادوں کے لئے بھی ایک شاہراہ کھول دی ہے۔

طہارت و کثرت وغیرہ بہت پسندیدہ صفحات، قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مرکز تصنیف و تالیف نکودہ (پنجاب) مجموعہ ہے جناب واقف رائے بریلوی کے کلام کا جسے سرفراز قومی پریس لکھنؤ نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ **زخموں کے چراغ** واقف صاحب کا ذوق سخن بھی تقریباً ویسا ہی ہے جیسا آجکل کے نوجوان شاعروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے یعنی ”وہی ادب برائے زندگی“ اور اس سلسلہ میں وہی سب کچھ کہ جانا جو زبان پر ہے اور دل میں نہیں۔ لیکن واقف صاحب کو یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ ان کی آواز میں ہمیں ان کی دل کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے اور اس طرح تمام اصلاحی داعیات سے قطع نظر ہمیں ان کے کلام میں ”ادب برائے ادب“ بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔ صداقت بڑی چیز ہے، سچائی کے ساتھ اگر کوئی گالی بھی دے تو لطف آ جاتا ہے، چہ جائے کہ کوئی معقول بات کہی جائے، اور یہی سچائی واقف کے کلام کی جان ہے، جس میں ہم کو کوئی نامعقول بات بھی نظر نہیں آتی اور پھر بھی معقول ہے۔ یہ مجموعہ دو روپیہ میں مکتبہ دانش محل لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

تذکرہ یوروپین شعراء اردو مجموعہ ہے ان لکچروں کا جنھیں خواجہ محمد یوسف الدین حیدر آبادی نے اردو مجلس حیدر آباد میں وقتاً فوقتاً پڑھے تھے اور اب انھیں کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب کا اردو چرہ ہے جس کا اعتراض خود فاضل لکچرار نے بھی کیا ہے، لیکن یوسف کی ”زینحایت“ بھی بہت کچھ شامل ہو گئی ہے اسلئے اس کی حیثیت ذرا مختلف ہو گئی ہے۔

یہ کتاب محض یوروپین اردو شعراء کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ اس عہد کی تاریخ بھی ہے۔ جب انگریز ہمیں کی معاشرت میں گھل مل گئے۔ ان میں سے بعض شعراء نے تو نہایت مشکل زمینوں میں بھی ایسے صاف و پاکیزہ شعر کہے ہیں کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ایک اجنبی قوم نے اردو کی ترویج و ترقی میں اتنا نمایاں حصہ لیا تھا، لیکن اب زمانہ وہ ہے جب خود انھیں بھی کوئی پروا نہیں جو اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں۔ یہ کتاب دو روپیہ آٹھ آنے میں مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔

سریے بول مجموعہ ہے عظمت اللہ خاں مرحوم کے کلام جس میں ان کے دو مضمون نشر کے بھی شامل ہیں۔ نظمیں مختلف عنوانات پر ہیں، لیکن سب کی سب غیر عاشقانہ ہیں اور نہایت سادہ زبان میں، یعنی باتیں کام کی اور زبان عوام کی۔ یہ التزام آسان نہیں۔

نثر میں ایک مضمون شاعری پر ہے، دوسرا عروض پر اور دونوں جدتوں سے خالی نہیں۔ افسوس ہے مرحوم کی عمر نے ان کی اہلیت و صلاحیت کا ساتھ نہیں دیا، ورنہ وہ اردو ادب میں کافی صحتمند اضافہ کرتے۔ اس کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ہے۔ اور ملنے کا پتہ یہ:۔

اردو مرکز - گنپت روڈ - لاہور

ڈالڈا پر بات چیت

کیا چکنائیاں موٹاپے کا باعث ہیں؟

آپ: کیا چکنائیاں موٹا نہیں کرتیں؟

ماہر غذا: اتنا نہیں جتنا آپ سوچتے ہیں۔

آپ: کیا مطلب؟

ماہر غذا: بات یہ ہے کہ کھانے میں جو چکنائی ہوتی ہے وہ بدن میں اتنی جلدی

چربی نہیں بنتی جتنی جلدی نشاستے والی چیزیں۔ جیسے کہ چاول، مٹاؤ

آپ: میں سمجھا نہیں۔

ماہر غذا: دیکھئے بات یہ ہے کہ موٹاپا محض آپکی خوراک ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ

یہ بہت کچھ اس بات پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ آپ اپنی خوراک

بخوبی ہضم کرتے ہیں یا نہیں۔

آپ: ادہ اب سمجھا۔

ماہر غذا: موٹاپے کا شکار موٹا وہی لوگ ہوتے ہیں جنکی قوت ہضم ناقص

ہوتی ہے۔ زیادہ تر یوں ہوتا ہے کہ نشاستے والی خوراک جب

پوری طرح رجتی بچتی نہیں تو بیشتر بدن میں چربی کی صورت

اختیار کر لیتی ہے۔

آپ: لیکن چکنائی والی خوراک سے بھی تو یہی ہوتا ہے...

ماہر غذا: نہیں، ایسا تو نہیں چکنائی اُن کھانوں میں سے ہے جو کم سے کم

موٹاپا لاتے ہیں کیونکہ اس کا اصلی کام قوت پیدا کرنا ہے بدن

میں جو چربی جمع ہو جاتی ہے اُسے بھی جسمانی قوت کا روپ دینے

میں چکنائی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

آپ: کیا یہ سائنٹیفک طور پر ثابت ہو چکا ہے؟

ماہر غذا: تحقیق اسے قطعی طور پر ثابت کر چکی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں

کہ موٹاپا دور کرنے کے جدید معالجے میں جو غذا دی جاتی ہے

اُس میں چکنائی اور پروٹین شامل ہوتی ہے۔ اور

کاربوہائیڈریٹس اور نشاستہ گھٹایا جاتا ہے۔

آپ: تو کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ کھانا کم کھانے اور کم کیلوریز

کی غذا کے بجائے، موٹاپا دور کرنے کا یہ بہتر طریقہ ہے؟

ماہر غذا: ہاں، کیونکہ کھانا کم کھانے اور کیلوریز گھٹانے سے آپ کا

وزن تو بیشک کم ہو جائیگا، مگر ایسی غذا، زیادہ چکنائی اور زیادہ

پروٹین والی غذا کے مقابلے میں کم قوت بخش ہوگی۔

ہم: بات بالکل سیدھی ہے۔ چکنائیاں قوت دیتی ہیں، بہت سی قوت۔

چٹا دل یا گیہوں سے کہیں زیادہ!

آپ: لیکن چکنائی کے براہ راست ذرائع کیا ہیں؟

ہم: تیل — کھانا پکانے کا کوئی بھی تیل، یا

ٹھوس چکنائیاں۔

آپ: ... اور کیا یہ سبھی تیل اور چکنائیاں قوت بخش ہوتی ہیں؟

ہم: جی ہاں۔ سبھی۔ لیکن ڈالڈا ونا سبھی جیسی کچھ ایسی چکنائیاں بھی

ہیں جنہیں قوت کے علاوہ کچھ اور بھی خوبیاں ہیں، مثلاً ڈالڈا میں

غذائیت بھی ہے۔

آپ: غذائیت؟

ہم: جی ہاں، کیونکہ ڈالڈا میں وٹامن ہیں — ہر ادس میں وٹامن

کے سات سو اور وٹامن ڈی کے ۵۶ بین الاقوامی یونٹس؛ یہ وٹامن

جموت کے محافظ اور جلد پر یوں، دانتوں اور آنکھوں کیلئے مفید ہوتے ہیں

آپ: اچھا! ...

ہم: بالیقہ ڈالڈا ونا سبھی ایک عمدہ ترین چکنائی ہے۔ یہ خالص دنا سبھی

تیلوں سے بنتی ہے اور اس میں پاکیزگی کا بہت بلند معیار قائم رکھا جاتا ہے

ڈالڈا کی نہ تو اپنی دھاس نہ ذائقہ، اسلئے اس میں پکا ہر کھانا اپنا اصلی مزہ

ہے۔ اور ڈالڈا ونا سبھی حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق تیار

تولوں میں ملتا ہے۔

آپ: ہاں، یہ تو ہم جانتے ہیں، ہمارے یہاں سبھی کچھ ڈالڈا ہی میں پکا ہے اور وہ

بھی پچھلے بیس برسوں سے!

ہم: سال بہ سال زیادہ سے زیادہ لوگ ڈالڈا ونا سبھی

کام میں لارہے ہیں کیونکہ یہ ایک آدرش چکنائی

ہے — کھانا، موٹاپا دور کرنے کے لئے

ہو یا آئے دن کا!

ہندوستان یورپ نے بنا دیا

فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادہ میں کا مذہب، انہایت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات حضرت نیاز کے اعتقادی مقالات کا مجموعہ، فرسٹ کلاس میں ہے۔ ایران و ہندوستان کا انگریزی شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ اور غزل گوئی پر عمدہ بہ عمدہ ترقی نقشبند رنگ رنگ (غالب کی فارسی گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون ایڈیٹر حقیقت نگاری قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مذہب اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز یعنی نیاز کی ڈرامی جوا ادبیات متینہ عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس سادہ کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت نفاس کا غزوہ طاعت کا خالص انتہام کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

فرسٹ لیمہ اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہمت کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یاد و سرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، سعادی شہرت پر مشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

مالہ و ما علیہ حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی کھوکھلی کھائی ہیں اور اس کا جو سنا محفول نے دور حاضر کے بعض کا بر شعرا، مثلاً جوش، جگر، سیلاب وغیرہ کے کلام کو سامنے لکھ کر پیش کیا ہے، ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ اذیس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

نقاب اٹھ جانے کے بعد نیاز فچوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت سم قاتل، زبان پلاٹ، انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہر وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ استفسارات تاریخی، علمی، ادبی معلومات کا ایک قیمتی ذخیرہ۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

نقشبند رنگ رنگ غالب کی فارسی غزل گوئی اور اس کی خصوصیات پر نیاز فچوری کا ایک مقالہ قیمت ۱۲ روپے (علاوہ محصول)

گلہائے جعفری۔ جناب اثر لکھنوی کے سوانح منتخب اشعار مع مقدمہ (نیاز فچوری) قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

دیگر مصنفین کی کتابیں

قول فیصل۔ جناب فخر جبر آبادی کی ایک طویل مرتبہ نظم جس میں جو دہاری پرنسپل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

فلاسفہ مذہب۔ سید مقبول احمد کی مشہور تہذیب و تمدن تصنیف جس میں عقائد اسلام پر فاضل بحث و تنقید کی گئی ہے قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

عورت و اسلام۔ جناب ملک ام ایملے کی مشہور تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کا درجہ کس قدر بلند کر دیا ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

مرثیہ نگاری و سیرامیس۔ ڈاکٹر محمد حسن فاروقی کا بے لاگ تبصرہ میر کی فن مرثیہ نگاری پر قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

ملک خطا کے غمزدار ہے۔ سید وحسی احمد بلگرامی کا ایک شامہ کار جس میں ایک خاص طنزیہ انداز سے شبلی وغیرہ کے بعض مذہبی نظریوں پر تنقید کی گئی ہے قیمت ۱۲ روپے (علاوہ محصول)

شاعر کا انجام (نیاز) ۱۲ جذبات بھاشا (نیاز) ۱۲

مینجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء (مومن نمبر) مومن نمبر ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از حد ضروری ہے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۸ء (پاکستان نمبر) پاکستان نمبر نگار کا جو پہلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے دور زریں کو بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تھی قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء (افسانہ نمبر) افسانہ نمبر جس میں تقریباً بیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ نگار کا افسانہ نمبر جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے باسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اصول کا سیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۱ء (مشرق وسطیٰ نمبر) مالک اسلامی کی سیاست اور ان کی موجودہ اقتصادی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے القذاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر بغداد میں آئے تھے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز میں کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۳ء (فرماں روایان اسلام نمبر) (فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا پچھراں جس میں نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء (علوم اسلامی نمبر) (علوم اسلامی نمبر) ہٹا یا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا ہے اس کے علاوہ تمام مالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات سے کر علمی ہندسہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۶ء (احد نمبر) (احد نمبر) خدا کا تصور عمرہ تاریک ملک بمبیل تاریخ بطور مذاہب عالم پر۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۷ء (اصناف سخن نمبر) (اصناف سخن نمبر) غزل، تنقید، مثنوی، رباعی، مرثیہ وغیرہ جملہ اصناف سخن پر ایک پیشہ بہا ذخیرہ معلومات۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۸ء (معلومات نمبر) یہ سالنامہ مجموعہ ہے بہت سی ایسی تاریخی، علمی، ادبی اور مذہبی معلومات کا جن کا علم ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ گویا ایک نفع کی سائیکلو پیڈیا ہے۔ قیمت پانچ روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۹ء (نتیج اسلام نمبر) (نتیج اسلام نمبر) اسلام و تعلیمات اسلام کا صحیح مطالعہ و ادبی اصول سے ہٹ کر خالص عقلی و اخلاقی نقطہ نظر سے قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۶۰ء نیا ذکا، انشا، الطیف نمبر جو بہترین ادب کا دل کا مجموعہ ہے مع متعدد تصاویر۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مینجر نگار لکھنؤ